

UNIVERSITY

پہر اولی ۱۰۰۰

نذر عقیدت

جس طرح ایک خالی خوان کی بے ہنگی کو چھپانے کے لئے اُس پر ایک زر کا
خوان پوش ڈال دیا جاتا ہے۔ اسی طرح ان اوراق پر میشان کی عیب پوشی کے
لئے میں ایک نسبت بزرگ ڈھونڈتا ہوں *

عمر کے بہترین پندرہ برس اخبار نویسی کے اس عہد میں گزرے جو ہندوستان
کی قومی زندگی کا ایک متلاطم اور یادگار عہد تھا۔ جب قومی خادموں کا امروز
ان کے فرد سے ہمیشہ نا آشنا ہوتا تھا۔ جب زندگی کا طور یوں تھا۔ کہ صبح کو گھر
سے چلے تو شام کو جیل خانے پہنچ گئے۔ اُس زمانہ میں قلم ٹوٹا نہ تھا۔ ہر لکھا۔
مگر بہت کچھ لکھا۔ لیکن قومی دریا کی دہا پر یہ سب کاغذ کی کشتیاں تھیں۔ جوتی
ہوئی نکل گئیں۔ کوئی ایک نقش بھی ایسا نہ تھا۔ کہ باقی رہ جاتا۔ نصیبی سے نہ کبھی
اتنی توفیق حاصل ہوئی۔ نہ اہلیت نصیب کہ ان کاغذ کی ناؤں کے علاوہ چند باقی
رہنے والے اوراق بھی مرتب ہوتے۔ ہر صبح کو جو کچھ اخبار کے صفحات پر تھوپا وہ
شام کو غریب عطار اور پنساری کے کام آیا۔ ۵۰ برس کی اخبار نویسی کی یہ ساری
روئیداد ہے! ارادے کئے بھی تو پورے نہ ہوئے کسی مستقل تصنیف و تالیف
کی صورت میں اپنے وطن کی کوئی خدمت کرنی چاہی تو بن نہ آئی۔ یا زمانہ بچے
مہلت نہ دی یا اس میدان میں قدم رکھنے کی ہمت نہ ہوئی یا اُس بازار میں جا

شرم آتی۔ جہاں ناولوں اور عاشقانہ افسانوں کے اوراق کا انبار ترازو میں تلکر
یا گڑیلوں اور جڑوں کے صاب سے گن کر فروخت ہوتا ہے!

یہ نام نہاد سفر نامہ جو محض سرسری مشاہدات کا ایک عکس ہے۔ میرے اور اُن
پریشان کا پہلا مجموعہ ہے۔ جو کتاب کی صورت میں شائع ہوتا ہے۔ اور وہ بھی محض
اس لئے کہ زبردستی ان متفرق اوراق کو ردی سے نکالا گیا۔ یہ استحصال بالآخر ایک
ایسے عزیز کا کام ہے۔ جسکے خلاف میری محبت مراغمہ بھی نہیں کر سکتی۔

اب کہ یہ اوراق ملک کے سامنے جاتے ہیں۔ انکی اور میری بے بضاعتی کا
پردہ دار صرف مسیح الملک کا نام ہے۔ اور میں اپنی تمام تر عقیدت و نیا زمندی
کے ساتھ چاہتا ہوں۔ کہ یہ ہدیہ حقیر اس شخص کے نام سے نسبت حاصل کرے۔
جس کا فیض صحبت میری زندگی کا چراغ ہے۔ کون جان سکتا ہے۔ کہ میں نے
حکیم اجل خاں کی پاکیزہ صحبتوں میں کیا کچھ سیکھا۔ اور کیا کچھ پایا۔
کیسے کیا۔ کہ میری زندگی کا سرمایہ بہت قلیل ہے۔ ورنہ یہ عزت تو ہندوستان
کے آئندہ مورخ ہی کو ملنی چاہئے۔ کہ اسکی مرتبہ تاریخ آزادی ہندوستان کا سرور
مسیح الملک کے نام سے مزین ہو۔ میری قلم کے بھونڈے نقوش اور میرے دماغ
کے تیلچ پریشان اس نام کی عظمت سے بہت دُور ہیں!

تاہم نیا زمندوں کو جو ایک ناز نیا زمندی ہوتا ہے۔ اسی نے مجھے بھی اتنی
جُرأت دلائی۔ کہ میرے ناظرین ان اوراق کو مسیح الملک کے نام نامی سے
منسوب پاتے ہیں۔

پھر دل طوافِ کوئے ملامت کو جاگے!

گذشتہ سال موسمِ گرما میں یورپ سے واپس آنے کے بعد چند ہفتے بمقامِ سکونِ جناب قبلہ مسیح الملک حکیم اجل خان صاحب کی پاکیزہ اور دلنفریب صحبت میں گزرے۔ اُن ہی چند ہفتوں میں یہ اوراق مرتب کئے گئے۔ مگر ان کی تکمیل نہ ہو سکی۔ اور دُنیا کے مکروہات نے پھر وہ سکونِ قلبِ حاصل نہ ہونے دیا۔ جوابِ زندگی کے باز ا میں میرے لئے بہت کم یا ب ہے کبھی چند لمحے ایسے نصیب نہ ہوئے۔ کہ دیاغِ و قلم میں یک گونہ آشتی ہو اور بہت سی کشاکش کے بعد بھی کاغذ پر چند نقوشِ متر ہو سکیں۔ در نہ اب تو ہمدرد و جمہور و صباح کے بعد یہ شیشہ خالی ہے۔ یا اس شراب میں کیف نہیں! طبیعت میں ایک انقلاب ہے۔ انقلاب نہیں۔ ایک نا قابلِ بیان اضمحلال ہے۔ اس شکستگی کی داستان بہت طویل ہے۔ اور ان صفحات پر خارج از بحث۔ غالبِ مغفور نے "واغِ فراقِ صحبتِ شب" اور شمع کی خموشی پر آنسو ہانٹے تھے۔ مجھ سے ہو سکتا تو میں خود اپنا ایک نوہ لکھتا۔ ایک دفعہ خود اپنا گفن سیتا۔ اور خود ہی اپنے جنازہ کو کا نہ صا دیتا!

قصہ مختصر یہ اوراق ہنوز مکمل نہ ہونے پائے تھے۔ کہ مجھے پھر ایک دفعہ یورپ کا سفر پیش آیا۔ ۲۲ مئی ۱۹۲۲ء کو یہ دوسرا سفر شروع ہوا۔ چلتے چلتے احباب

سے وعدہ کیا تھا۔ کہ جس طرح ہو سکے گا۔ سمندر کے اس دوسرے سفر میں کم از کم پہلے سفر کی داستان تو مکمل کرونگا۔ جہن بھتی سے روانہ ہوا۔ اُسی دن سے اس وعدہ کا بہت خیال تھا۔ اور بڑا بھلا جو کچھ ہو سکا لکھتا رہا۔ آخر بمشکل آج ٹھیک اسی وقت جب کہ ہمارا جہاز جزیرہ کریٹ کے سامنے گزر رہا ہے۔ میں یہ آخری سطور لکھ رہا ہوں۔ تاکہ فرانس پہنچتے ہی ان تمام اوراق کو ہندوستان روانہ کر دوں۔ میں جانتا ہوں۔ کہ اس داستان کی اشاعت میں بہت دیر ہوئی۔ مضامین کی ترتیب نہایت خراب ہے۔ مطالب بھی اس طرح ادا نہ ہوئے۔ جس طرح میں ادا کرنا چاہتا تھا۔ عجلت اور اختصار کے خیال سے بہت سے اجزا جو پہلے شامل کرنا چاہتا تھا۔ اب نظر انداز کرنے پڑے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ جو تصویر میں ان اوراق میں کھینچنا چاہتا تھا وہ نہ کھینچ سکا۔ یہ جو کچھ ہے میرے تخیل کا ایک دہندہ لاسا عکس بھی نہیں محض اجاب کا اصرار مجھے اس رومی کے شائع کرنے پر مجبور کر رہا ہے۔ اگر لوگ ان صفحات کو پڑھیں یا اگر یہ داستان عام طور پر مقبول ہو تو یہ واقعہ میرے لئے تعجب انگیز نہ ہوگا۔ و جو ایک خیال تھا۔ کہ یہ سفر نامہ کوئی نئی چیز ہو اور اچھی چیز ہو۔ وہ سب چند صفحات لکھنے کے بعد ہی خاک میں مل گیا تھا۔ اب یہ کشکول چند سوکھے ٹکڑوں سے بھرا ہوا ہے۔ جو ادھر ادھر سے جمع کر لئے گئے ہیں۔ جو دسترخوان بچانا چاہتا تھا۔ وہ خالی ہے! اپنی بے مائیگی کے اس اعتراف کے بعد اور کیا لکھوں

عبد الغفار
۴ جول ۱۹۲۲ء

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

تمہید کلام

یورپ میں ہمارا کم و بیش ڈھائی ماہ کا سفر ۳۰ تاریخ کو جب ہم مارسیلز سے
جہاز پر سوار ہو کر عازم وطن ہوئے ختم ہو گیا۔ آج دو دن ہوئے۔ کہ میں اور ڈاکٹر
مختار احمد انصاری پی اینڈ او کمپنی کے جہاز کیلنڈ ڈنیا پر سوار ہیں۔ ہر ساعت
جو گزرتی ہے وطن سے قریب تر پہنچا رہی ہے۔ ہر روز یورپ دور ہوتا جاتا ہے۔
الحمد للہ!

جب میں ہندوستان سے روانہ ہوا تھا۔ تو دوستوں نے چلتے چلتے تاکید
کر دی تھی۔ کہ جو کچھ دیکھوں قلمبند کرتا جاؤں۔ اور احباب کے لئے کوئی سوغات
نہ لاؤں۔ تو کم از کم ایک سفر نامہ تو مرتب ہو جائے۔ وعدے تو سب کچھ
کر لئے تھے۔ مگر اس تین ماہ میں چند صفحات سے زیادہ کچھ نہ لکھ سکا۔ کچھ تو وفد
کے متعلق اپنے فرائض اور کچھ انگلستان و یورپ کے حالات سے دماغ کی بے
لطفی و پراگندگی۔ غرض ایک معمولی یادداشت بھی مرتب نہ ہو سکی۔ اب جو لکھنے

بیٹھا ہوں تو اس مسودہ کی ایک ایک سطر کٹھن ہے۔ دماغ میں اس سفر کے متعلق شاید چند ہی اجزائے پریشان محفوظ ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کر سکتا ہوں کہ اُن کی شیرازہ بندی کر دوں!

پڑھنے والے اِن اوراق کو سفر نامہ تصور نہ کریں۔ ورنہ مایوس ہونا پڑے گا۔ نہ یہ چھوٹی سی کتاب اس غرض سے مرتب کی جاتی ہے کہ آئندہ یورپ کے جانے والوں کو جہاز کا کرایہ بٹھرنے کے لئے ہوٹل۔ سیر و سیاحت کے لئے مشہور مقامات کا حال معلوم ہو۔ اگر پڑھنے والوں نے ان اوراق کا مفہوم یوں سمجھا تو میرا مقصود حاصل نہ ہوگا۔ اور محنت اکارت جلتے گی *

چند الفاظ میں بتا دوں کہ کیا لکھ رہا ہوں۔ اور کیوں لکھ رہا ہوں۔ حقیقت یہ ہے کہ اِن اوراق کے اندر ایک شخص واحد کے دماغ و دل کی اُن کیفیات کا پر تو ہے۔ جو انگلستان۔ فرانس۔ سوئٹزرلینڈ و اٹلی کے مناظر کو ایک نظر و مکتبہ ہوا گزر گیا۔ اور جس نے اِن ممالک میں کہیں کہیں یورپ کی قومی زندگی کے نور و ظلمت کو بھی دیکھ لیا۔ بس۔ یہ سطور جس نقطہ نظر سے لکھی گئی ہیں۔ وہ ایک معمولی حیثیت کے مسلمان اور ایشیائے اُد کا نقطہ نظر ہے۔ لکھنے والا تین مہینہ تک یورپ میں پھرتا رہا۔ لیکن ہر قدم پر اُس کے مشاہدات خالص ایشیائی نقطہ نظر پر مبنی رہے۔ جس چیز پر اس کی نظر گئی معاں اس کے ایشیائی تخیل نے اُس چیز کو مشرقی معیار پر کس لیا۔ اور اس طرح انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے مغربی تخیل کا (جہاں تک سمجھ میں آسکا) مشرقی تخیل میں ترجمہ کر دیا۔ اگر میں کوئی سفر نامہ یا اس سفر کا روزنامہ لکھتا۔ تو وہ ایک دوسری اور میرے خیال میں کمتر چیز ہوتی۔ یہ سب باتیں تو ٹامس گک کمپنی کے دفتر میں معلوم کی جاسکتی ہیں۔ یہ نہیں کہ میں نے ہر ملک کے مشہور مقامات کو دیکھنے کی کوشش نہ کی

ہو۔ مگر فرق یہ ہے۔ کہ میں درودِ دیوار و نقش و نگار کے حالات بیان کرنا نہیں چاہتا۔ بلکہ یورپین زندگی کا جو نقشہ میں نے دیکھا۔ اس کے متعلق اپنے خیالات کو ضبطِ تحریر میں لانا چاہتا ہوں۔ آثارِ قدیمہ۔ ہٹل۔ قہوہ خانے۔ لچ گھر۔ قصہ سرود کے ہنگامے۔ ٹھیکڑوں کے رنگینیاں باغوں کی صحبتیں۔ ہوٹلوں کی زندگی کے تماشا ہائے خفی و جلی۔ و دیگر لوازمِ بعیش۔ پھر ارزاں معصیت اور ارزان تر اخلاقِ انسانی۔ گراں ضروریاتِ زندگی۔ اور گراں تر خصائلِ انسانیت۔ محدود جغرافیائی قومیت کا تخیل اور وہ کورانہ قدامت پسندی جس کو آژاد خیالی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ پھر اس قدامت پسندی کے چپ و راست تعصبات رنگ و نسل۔ یہ سب کچھ دیکھا۔ لیکن بتانا صرف یہ ہے۔ کہ ایک کالے رنگ کا انسان گورے ملکوں کی اس زندگی سے کس طرح متاثر ہوا۔ ہر سطحِ جوان اور افسانہ میں آپ پڑھیں۔ اسی اصول کے ماتحت ہے۔ اور میں چاہتا ہوں۔ کہ ان سطور کے لکھنے والے کو نہ جہاں گرد سیلح سمجھا جائے۔ نہ پُرگو اور ہمہ دال مصنف تصور کیا جائے۔ نہ معاملہ فہم ماہر سیاست یا زمانہ شناس مدبر قرار دیا جائے۔ بلکہ صرف یہ سمجھ لیا جائے۔ کہ ایک شخص واحد جو ہندوستان میں پیدا ہوا۔ اور یہ سن شعور کو پہنچا۔ جس نے ہندوستانی اور مسلمان ماں باپ کے آغوش میں پرورش پائی۔ اور اپنی ہندوستانی سوسائٹی میں تعلیم و تربیت حاصل کی۔ پھر عمر کے تقریباً ۳۷ سال اسی بد نصیب ملک میں۔ اور اخلاقی پستی اور سیاسی غلامی و مجبوری کی ایسی حالت میں گزارے جو اس ملک کے چپہ چیمہ پر ہویدا ہے۔ وہ شخص واحد تین مہینہ کے لئے یورپین ممالک اور مغربی تہذیب کے چند سرسری نظارے دیکھتا ہے۔ جن سے اس کا اپنی تخیل متاثر ہوتا ہے۔ اور اس طرح جو نقوش اس کے دماغ پر مترتب ہوتے ہیں۔ ان کو وہ بقدر اہلیت اپنے ملک کے سامنے

پیش کرتا ہے۔ شاید کہ سمجھنے والے ان الفاظ کے اندر کوئی نقش عبرت بھی دیکھ سکیں۔ ان اوراق کی ایک سطر بھی اگر میرے ملکی اور مذہبی بھائیوں کو مشرق و مغرب کے "تفاوتِ راہ" کی طرف یک گونہ متوجہ کر دے۔ تو میں سمجھونگا کہ میرا قلم کامران اور میرا مقصود حاصل ہے *

ایک بات اور عرض کر دوں۔ چونکہ میں دوسرے وفدِ خلافت کے سکرٹری کی حیثیت سے گیا تھا۔ اور نیز چونکہ ملک میں وفد کے متعلق بعض غلط فہمیاں پیدا ہو گئی ہیں۔ جن کا کافی جواب نہیں دیا گیا۔ اس لئے میں نے قیام انگلستان کا ذکر کرتے ہوئے ضروری سمجھا تھا۔ کہ وفد کے متعلق تمام ضروری امور کو جو قلم کر دوں۔ چنانچہ ان اوراق کا ایک جزو وفد کے حالات اور ان حالات کے سلسلہ میں بعض ضروری کاغذات کی نقول کے لئے مخصوص کرنا پڑا تھا۔ لیکن وہ وقت گزر گیا۔ کچھ میرا تساہل کچھ زندگی کے کمزوریاں۔ کچھ سیاسی مشاغل کی دوا دوش۔ غرض دو برس ہو گئے۔ اور یہ مسودہ ایک طرف پڑا رہا۔ اب وفد کے متعلق ان صفحات کے متفرق اجزاء کو دیکھتا ہوں۔ تو وہ بہت بعد از وقت ہیں۔ اور اس دو برس میں دنیا بہت آگے نکل چکی ہے۔ حتیٰ کہ میں خود اپنے وجود کو پس ماندہ پاتا ہوں۔ قافلہ کہیں سے کہیں پہنچا۔ اب اُس گروکاروان کا پریشان کرنا فضول ہے۔ جب کبھی قومی تحریکات کی کوئی تاریخ لکھی جائے گی۔ تو ہم غریبوں کی وہ تمام جہ پائی بھی مورخ بیان کرے گا جس کے نشان ابھی پیشانیوں پر موجود ہیں! ہر جہ جہنم ان بند دروازوں پر کیا ہے۔ لکھا جائے گا۔ ہر ٹھوکہ جہنم کی آونچی آونچی دہلیزوں پر کھائی ہے بیان ہوگی۔ اور ہر وہ مشت خاک جو انھوں میں جھونکی گئی ہے۔ کاغذ کے صفحات پر پھیلانی جائیگی۔ اُس وقت تک ان صفحات میں یورپ کی عام زندگی کے چند نمائش دیکھ لیجے اور کچھ نہ دیکھئے * عبدالغفار۔ اپریل ۱۹۲۷ء

دعوت

مولانا محمد علی اور دیگر اراکین وفد خلافت کی واپسی کے بعد ہر شخص نے یہ سمجھ لیا تھا کہ جہاں تک اہل برطانیہ اور برطانوی وزیر کا تعلق ہے۔ مسلمانان ہندوستان نے آخری حجت پیش کر دی۔ اس کے بعد عرض و معروض اور دلائل و براہین کی نہ ضرورت ہے نہ گنجائش۔ ہم نے اپنے بہترین ترجمان ان کی خدمت میں بھیج دیئے۔ کوئی پہلو نہ تھا۔ جو پیش نہ کیا گیا ہو۔ کوئی بحث نہ تھی۔ جو نہ اٹھائی گئی ہو۔ کوئی دلیل نہ تھی۔ جو مطالبہ حق و انصاف میں برروے کار نہ لائی گئی ہو۔ وزیر اعظم و دیگر وزراء کو ان کے وعدے یاد دلانے گئے۔ اخبارات اور عام جلسوں کے ذریعہ سے مطالبہ حق و انصاف کی راہ میں جو سعی ممکن تھی کی گئی۔ کوئی دروازہ باقی نہ تھا جس پر جا کر عرض حال نہ کیا ہو۔ اس سعی بے حاصل میں وقت اور پیسہ ضائع کرنے کے بعد کیا تعجب ہے۔ اگر مسلمانان ہند اور ان کے برادران وطن نے یہ سمجھ لیا کہ اب کشود کار کے یہ ذرائع بے سود ہیں +

بالآخر ہم اُس منزل سے گزر گئے۔ جہاں انصاف و حق کا نام لے کر گدایانہ ہاتھ پھیلا یا جاتا ہے۔ پس کسی دوسرے وفد کا بھیجا جانا خیال و گمان سے بھی باہر تھا۔ لیکن انگلستان کے خداوندان تدبیر ان کا غذ کے پرزوں کو لٹے بیٹھے تھے۔

جن کا نام محمد نامہ سیوری ہے۔ اور نہیں جانتے تھے۔ کہ کس طرح مصطفیٰ کمال اور قوم پرست ترکوں کو اس گولی کے ٹھکنے پر مجبور کریں۔ وہی "باغی" اور "سرکش" ٹیڑھے" جو اب انگور میں ملت عثمانی کا جھنڈا بلند کر چکے تھے۔ نوازے جا رہے تھے۔ چند ہفتے پہلے جس اسلامی جمہوریت کے وجود کو تسلیم کرنے سے قطعاً انکار کیا گیا تھا۔ اُسی کے نمایندے لندن میں مدعو کئے جا چکے تھے۔ اور اب کوشش ہو رہی تھی۔ کہ طوفانی سمندر پر تیل ڈالا جائے۔ شاید شاطران سیاست کی اس چال میں ہندوستان کے چند نام نہاد نمایندوں کو بھی شریک کرنا ضرور تھا۔ اور اس لئے چند مخصوص اشخاص اُس دعوت سے سرفراز کئے گئے۔ جس کی نوعیت کا علم اگر ہو تو شاید ہندوستان سر آفاخاں یا مسٹر سید حسن امام کو ہو یہیں تو کیسے نہ تھا۔ خصوصاً خادمانِ خلافت تو اس آنے والی دعوت اور نصیب ہونے والی عزت سے بالکل ہی بے خبر بیٹھے تھے۔ ایک ہفتہ پہلے تک خود صدر خلافت کمیٹی کو پتہ نہ تھا۔ کہ اُن پر بارگاہ وزارت عظمیٰ کا یہ سمن تعمیل ہونے والا ہے +

میں اُس زمانہ میں دہلی میں موجود تھا۔ اور مہاتما گاندھی کے علاوہ دیگر اکابرین قوم بھی وہاں صبح تھے۔ ۵ فروری کی شام کو ڈاکٹر انصاری صاحب نے مجھے بلایا ان کے یہاں پہنچ کر معلوم ہوا۔ کہ صبح سیٹھ چھوٹانی صاحب کا ایک تار مہاتما جی کے پاس آیا تھا۔ جس میں سیٹھ صاحب موصوف نے لکھا تھا۔ کہ ان کو گورنٹ مہیٹی کے ذریعہ سے وزیر اعظم نے لندن طلب کیا ہے۔ تاکہ خلافت اور مسئلہ شریعہ کے متعلق جو معاملات سپریم کونسل کے سامنے پیش ہیں۔ اُن کی نسبت کچھ مشورہ (مشورہ! اللہ سے نصیب!) کریں۔ سیٹھ صاحب نے مہاتما جی سے دریافت کیا تھا۔ کہ ان کو کیا کرنا چاہئے۔ مہاتما گاندھی کا جواب صاف اور مختصر مگر قطعی یہ تھا۔ کہ سیٹھ صاحب کو جانا چاہئے۔ مگر ڈاکٹر انصاری صاحب کو بحیثیت مشیر و وزیر

ساتھ لینا چاہتے۔ اس عرصہ میں ہر طرف تارہ دوڑ رہے تھے۔ اور اکابرین قوم جلد جلد بمبئی جا رہے تھے۔ کہ وہاں ایک جگہ بیٹھ کر مشورہ کیا جائے۔ ابھی تک کچھ معلوم نہ تھا۔ کہ سیٹھ صاحب کے علاوہ کس کس کو طلب کیا گیا ہے۔ تاہم جو لوگ مسٹر لائڈ جارج کے دانشناس ہیں۔ ان کو یہ خیال پیدا ہوا تھا۔ کہ خلافت کمیٹی کے صدر کے علاوہ بھی چند اصحاب بلائے گئے ہوں گے۔ تاکہ برطانوی وزیر اعظم کے ترازو کے پتے اس کی خواہش کے خلاف نہ جھکنے پائیں۔ چونکہ وقت کم تھا۔ اور تاکید یہ تھی۔ کہ سیٹھ صاحب کو پہلے جہان سے جو ۱۹ فروری کو روانہ ہوتا تھا۔ عازم انگلستان ہونا چاہیے۔ اس لئے برقی رسل و رسایل اور ہوائی مشوروں سے قطع نظر کر کے یہ طے پایا۔ کہ ڈاکٹر انصاری صاحب اور جناب حکیم اجمل خان صاحب فوراً بمبئی تشریف لے جائیں۔ اور آخری فیصلہ وہیں جا کر ہو۔ ڈاکٹر انصاری صاحب کی تجویز کے مطابق یہ بھی قرار پایا۔ کہ میں ان شاہی مہمانوں کے ہمراہ جاؤں۔ (شاید کہ اس حج اکبر کا تھوڑا ثواب میرے حصے میں بھی آئے!) اکثر احباب کا بھی خیال تھا۔ کہ میرا جانا موجودہ حالات میں ہر طرح مناسب ہوگا۔ اسی زمانہ میں حکومت دہلی کی توجہات نے مجھے اخبار صبح کے ترددات سے یک گونہ فارغ کر دیا تھا۔ چنانچہ میں نے بمبئی جانے کا ارادہ تو کر دیا۔ لیکن اپنے سفر انگلستان کا فیصلہ بمبئی پہنچنے تک ملتوی رکھا۔ تاکہ جو اصحاب وہاں پہنچ جائیں۔ ان ہی کے مشورہ پر میرے جانے کا انحصار ہو۔ ۱۵ تاریخ کی شب کو میں وطن آیا۔ اور جناب حکیم صاحب و ڈاکٹر صاحب ۱۶ کی صبح کو بمبئی روانہ ہو گئے۔ دن بھر وطن میں رہ کر میں ۱۶ کی شب میں روانہ ہو گیا۔ احباب و اعزاء کو کوئی اطلاع نہ تھی۔ کہ میں کہاں جا رہا ہوں۔ خود اپنے اہل و عیال کو بھی نہ بتا سکا۔ کہ مجھے اس قدر طویل سفر درمیش ہے۔ ۱۸ تاریخ کی سہ پہر کو بمبئی پہنچا۔ اور اسٹیشن پر معلوم ہوا۔ کہ میرا

جانا طے پایا ہے۔ اور صبح کو وہ بچے جہاز پر سوار ہو جاتا ہے !
 لوگ سفر انگلستان کی تیاریاں ہفتوں اور مہینوں پہلے کرتے ہیں۔ کم از کم
 اپنے اہل و عیال سے رخصت ہوتے ہیں۔ اپنے کاروبار کا کوئی انتظام کرتے
 ہیں۔ یہاں خانہ بدوشی کا یہ عالم تھا کہ ۱۹ کی صبح کو روانہ ہوئے۔ اور ۸ کی شام
 تک یہ بھی خبر نہ تھی کہ صبح ہندوستان سے رخصت ہونا ہے۔ اس سفر نگاہاں کا
 لطیف ہی کچھ اور تھا ! جہاز پر سوار ہو جانے کے بعد اہل و عیال کو بذریعہ تار اطلاع
 دی گئی کہ میں روانہ ہو گیا ! سفر انگلستان کی یہ بے اختیاری و بے سروسامانی
 ہمیشہ یاد رہے گی۔ نظر غور سے دیکھتے۔ تو واقعی ہندوستان کی سیاسی جدوجہد
 کا یہ عہد بھی یاد رہے گا۔ کہ جب لوگوں کو طویل سے طویل سفر کے لئے کمزور
 باندھنے کا موقع نہ ملتا تھا۔ اور پہلے اس سے کہ مسافر اپنے سفر کے اوقات طے
 کرے۔ دفعتاً رونما ہونے والے واقعات کا ایک بگولہ اٹھتا تھا۔ اور اُس کو
 ہندوستان کے ساحل سے اٹھا کر انگلستان کے ساحل پر رکھ دیتا تھا۔ مورخ
 جب اس عہد کی تاریخ لکھنے بیٹھے گا۔ تو اس قسم کے واقعات میں اُس کو ہندوستان
 کی سیاسی زندگی کا ایک ایسا پہلو نظر آئے گا۔ جو کشاکش حیات کے اُن ہنگاموں
 پر روشنی ڈالے گا۔ جن میں یہ براعظم آج مبتلا ہے !

وفد کی نوعیت

مجھے تو بمبئی پہنچ کر معلوم ہوا۔ کہ سیٹھ چھوٹانی صاحب کے علاوہ ہنزائیس
 آغا خان اور مسٹر سید حسن امام بھی طلبیدہ جا رہے ہیں۔ پھر جہاز پر سوار ہوتے
 وقت دیکھا۔ کہ مشیر حسین قدوائی صاحب بھی رفیق سفر ہیں ! اس طرح ۶ اشخاص

کی یہ ایک چھوٹی سی جماعت ایک ہی غرض کے لئے آمادہ سفر نظر آئی۔ اس معجون
 مرکب نے اصطلاح عام میں ایک وفد کی صورت اختیار کر لی۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے
 کہ اس جماعت کو کسی طرح بھی وفد خلافت کے نام سے موسوم نہیں کیا جاسکتا۔
 اول تو یہ تمام اصحاب وزیر اعظم کے طلبیدہ تھے۔ اور کسی حالت میں ان کو ہندو
 کا قائم مقام نہیں کہا جاسکتا۔ نہ خلافت کمیٹی نے کسی وفد کے بھیجنے کا فیصلہ کیا تھا
 علاوہ برین عامۃ الناس نے تو نہ صرف ان میں سے کسی کو اپنا نمائندہ قرار نہیں
 دیا تھا۔ بلکہ صاف طور پر بعض اصحاب کے متعلق اپنی بے اطمینانی ظاہر کی تھی
 جاتے وقت یہ بھی معلوم نہ تھا۔ کہ کس غرض سے بلائے گئے ہیں اور انگلستان
 میں کیا کام کرنا ہوگا۔ خیال یہ تھا۔ کہ شاید سپریم کونسل کے سامنے پیش کئے
 جائیں۔ مگر انگلستان جا کر سپریم کونسل تو گنجائش خود وزیر اعظم تک بھی باریابی دشوار
 ہوئی۔ غرض یہ قافلہ جو کچھ بھی ہو وفد خلافت تو ہرگز نہ تھا۔ خود بمبئی میں جب یہ
 معلوم ہوا۔ کہ ہزٹینس آفاخان اور مسٹر حسن امام بھی جا رہے ہیں تو بعض اراکین
 خلافت کمیٹی نے صاف طور پر یہ رائے دی۔ کہ سیٹھ چھوٹائی و دیگر اراکین خلافت
 کمیٹی کا ایسی حالت میں انگلستان جانا بے کار ہوگا۔ وہ کہتے تھے۔ کہ ان اصحاب کے
 طلب کرنے سے ہوا کا رخ ظاہر ہوتا ہے۔ اور بہت ممکن ہے۔ کہ خادمانِ خلافت
 اور ان حضرات کے درمیان جو اصولی اختلافات موجود ہیں۔ ان سے وزیر اعظم
 ناجائز فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کریں۔ مسٹر حسن امام بلحاظ اپنی اعلیٰ شہرت
 و قابلیت کے ایک قابل احترام شخصیت رکھتے ہیں۔ ہندوستانی سیاسیات کے
 گذشتہ دور میں ان کا پایہ بلند تھا۔ اتنا بلند تھا۔ کہ ایک سال کانگریس کے صدر
 بھی منتخب ہو گئے تھے۔ لیکن یہ وہ زمانہ تھا۔ جب ہنوز اعتدال و احتیاط و
 مصلحت وقت کے بلند میناروں پر بابو سریندر ناتھ بنیرجی اور فیروز شاہ متا

کے جھنڈے اُڑ رہے تھے پچھلی صفوں کے سپاہی آگے بڑھنا چاہتے تھے۔ اور اگلی صفوں کے سوراخان کے سامنے دیوار کی طرح کھڑے تھے۔ لیکن زمانہ پچھلی صفوں کو آگے بڑھانے گیا۔ اور اگلی صفوں والے پیچھے رہ گئے۔ مسٹر حسن امام اُسی پیچھے رہ جانے والی صفِ اول کے ”آزمودہ کار“ ہیں۔ ان کی قومی زندگی کے ساتھ جو روایات وابستہ ہیں۔ وہ ایسی نہ تھیں۔ کہ عہدِ نو کے کام کرنے والوں کو سید صاحب کی رائے پر بھروسہ کرنے کے لئے تیار کرتیں۔ اس میں شک نہیں کہ ہنرمائیں آغا خان کی شخصیت بہت زیادہ دلکش اور دلچسپ اور دلربا ہے۔ مگر وہ بھی باوجود اپنی اعلیٰ دماغی قابلیت کے سوئزر لینڈ وائلی کی پر فضا وادیوں اور جھیلوں اور پیرس لندن کی گونا گوں دلچسپیوں میں ہندوستانی سیاسیات کے مد و جزر کو بظاہر بھول چکے ہیں۔ ان دوز بردست شخصیتوں کے وسط میں سیٹھ چھوٹانی صاحب کا بٹھایا جانا ان لوگوں کو گوارا نہ تھا۔ جو سیاسی عقاید کے اختلاف سے مانوس نہیں ہوتے۔ اور کھلا ہوا امتیاز قائم رکھنا چاہتے ہیں۔ بہر حال چونکہ بالآخر خلافت کمیٹی کے اراکین کی کثرت رائے اسی طرف تھی۔ کہ سیٹھ صاحب اور ان کے ہمراہ ڈاکٹر انصاری صاحب اور میں وزیر اعظم کی دعوت کو قبول کر لیں اس لئے اختلافات کا یہ ”مرکب“ تیار ہو گیا۔ ساتھ ہی یہ اُمید بھی بیجا نہ تھی۔ کہ شاید ہمسفر ہونے کی حالت میں جو تبادلہ خیالات ہوگا۔ اس کے بعد کوئی متفقہ صورت پیدا ہو جائے۔ اور وزیر اعظم کے روبرو تمام اصحاب اگر یکدل ہو کر نہیں تو کم از کم یک زبان ہو کر اپنے مطالبات کو پیش کر سکیں۔



صبح کو جہاز روانہ ہونے والا تھا۔ اور شب کو مسلمانانِ ممبئی کا ایک عام جلسہ اس غرض سے منعقد ہوا۔ کہ سیٹھ چھوٹانی صاحب و دیگر اصحاب کو خدا حافظ

کئے۔ اس موقع پر سیٹھ صاحب ڈاکٹر انصاری صاحب اور میں نے وزیر اعظم کی اس دعوت کے متعلق اپنے خیالات مختصر عرض کر دیے تھے۔ میں نے صاف طور پر (اور ایک محترم بزرگ کی رائے میں ضرورت سے زیادہ صاف طور پر) کہہ دیا تھا۔ کہ ہم عرض و معروض کے لئے نہیں جا رہے ہیں۔ جس دن ہمارا وفد خلافت نامہ کام واپس کیا گیا۔ اُسی دن عرض و معروض کے دروازے بند ہو چکے تھے۔ بلکہ اس کے بعد خود حکومت نے اپنے طرز عمل سے اُن دروازوں کو تالے لگا دیئے۔ اور اُن تالوں پر مہریں لگا دیں۔ پس ہمارا دست طلب اب برطانوی دروازہ کے سامنے کیونکر پھیلے؟ ہم کو طلب کیا جاتا ہے۔ اور ہم جاتے ہیں۔ صرف اس لئے کہ برطانوی وزیر کو یہ کہنے کا موقع نہ ملے۔ کہ ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندوں کو بلایا۔ اور وہ نہ آئے۔ وہ جھگڑا کرنے پر تیار ہیں۔ اور مصالحت پر آمادہ نہیں۔ وہ آتے تو اس دفعہ تمام قضیے طے ہو جاتے۔ محض اس قسم کے الزاموں سے بچنے کے لئے خلافت کمیٹی کے صدر نے وقت اور روپیہ ضایع کرنا گوارا کیا۔ پھر میں نے صاف بتا دیا تھا۔ کہ یہ کوئی وفد نہیں ہے۔ جو بھیجا جا جا رہا ہو۔ بلکہ چند اشخاص ہیں۔ جن کو وزیر اعظم نے معلوم نہیں کس خیال سے بلایا ہے۔ ان میں سے ہر شخص اپنی ذاتی رائے وزیر اعظم کے سامنے پیش کر سکتا ہے۔ البتہ جو لوگ خلافت کمیٹی سے وابستہ ہیں۔ ان کے لئے خلافت کمیٹی کا بنیادی اصول اور وہ دستور العمل موجود ہے۔ جو ہندوستان کے ہر گوشہ میں شایع ہو چکا ہے۔ اور ہر مجلس میں سنایا جا چکا ہے۔ وہی دستور العمل عامۃ الناس کی خواہشات و مطالبات کا آئینہ ہے۔ اور اُسی پر ہر خادم خلافت کو پوری طرح کاربند ہونا ہوگا۔ اس دستور العمل میں کسی قسم کا تغیر و تبدل کرنا خادمان خلافت کے اختیار سے باہر ہے۔ اس لئے۔ کہ وہ شریعت اسلامی کے کھلے ہوئے احکام

پر مبنی ہے۔ پس میں نے اپنی تقریر میں اس نکتہ کو اچھی طرح بے نقاب کر دینا ضروری سمجھا کہ ہم کسی سمجھوتہ کے خیال سے نہ جا رہے ہیں۔ نہ جاسکتے ہیں۔ ہم تو صرف یہی کر سکتے ہیں۔ کہ پھر ایک دفعہ وزیر اعظم دو دیگر وزراء کے سامنے اپنے مطالبات کو پیش کر دیں۔ اور پھر ایک دفعہ ان مضامین کی تشریح و توضیح کر دیں جو بار بار بیان کئے جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم معذور ہیں *
مجھے معلوم نہیں۔ کہ میری تقریر عام طور پر کس نظر سے دیکھی گئی۔ مگر یہ ضرور اُمید ہے۔ کہ جن محترم بزرگ نے اُس وقت نہایت نرم لہجہ میں میری صاف گوئی پر مجھے ٹوکا تھا۔ وہ اب میرے الفاظ کو قابل اعتراض نہ سمجھتے ہوں گے۔ اس لئے کہ اگر ان کا یہ خیال تھا۔ کہ ہم اپنا طرز عمل ایسا رکھیں۔ کہ ہماری طرف سے گفت و شنید اور سمجھوتہ کا دروازہ بند نہ کیا جائے۔ تو اب اس حقیقت سے کیونکر انکار کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ دروازہ تو اس وقت بھی بند تھا۔ جب ہم بلائے گئے تھے۔ اس وقت بھی بدستور بند رہا۔ جب ہم لندن پہنچے۔ اور اب کہ ہم ہندوستان آگئے۔ اب بھی اُسی طرح بند اور مقفل ہے *
~~~~~

الغرض ان حالات میں اور ان خیالات کے ساتھ ہم نے وطن عزیز کے ساحل کو خدا حافظ کہا \*  
~~~~~

خدا حافظ

۹ تاریخ کی صبح کو ہمارا چھوٹا سا قافلہ سمندر کے ساحل پر احباب و اعزاء سے رخصت ہو رہا تھا۔ بمبئی کے اور باہر کے بہت سے احباب جمع تھے۔ اور وہ تما

بھی ہو رہا تھا۔ جو ایسے موقعوں پر ہوا کرتا ہے۔ اگر ان پھولوں کو یکجا وزن کر سکو
جو میں نے اپنی عمر میں دیکھے یا استعمال کئے ہیں۔ تب بھی ان کا مجموعی وزن اُن
ہاروں اور گلہ ستنوں سے یقیناً کم ہوگا۔ جو ۱۹ کی صبح کو میرے جسم پر لادے گئے
تھے گلے میں ہار ڈالے جا رہے تھے۔ اتنے کہ بلا مبالغہ دم گھٹ رہا تھا۔ ہاتھوں
میں گلہ ستنے دیئے جا رہے تھے۔ اتنے کہ سنبھالے نہ سنبھلتے تھے۔ مجھ پر سادہ لوح
مسلمانوں کی عقیدت و محبت برس رہی تھی۔ اور خدا جانتا ہے۔ کہ عقل سلیم مجھے
ملامت کر رہی تھی۔ نفس ایک پختہ کارڈاکو کی طرح جو کسی بڑے مہاجن کی دو
لوٹ کر خوش ہو رہا ہو۔ چاہتا تھا۔ کہ میں اس کے تمام تر احساس حیوانی میں غرق
ہو جاؤں۔ مجھ سے داد چاہتا تھا۔ کہ ذرا دیکھنا۔ مہربانی کے یہ لکھ پتی اور کرٹا پتی کچھ
کس طرح ٹھجک ٹھجک کر سلام کر رہے ہیں! دیکھ تو وہ تیرے ہاتھوں کو بوسہ دے
رہے ہیں۔ وہ تیرے گلے میں ہار پہنا رہے۔ تیرے قدموں پر پھول برس رہے
رہے ہیں۔ وہ تیری توصیف میں رطب اللسان ہیں۔ تو ان کی نظر میں ایک
ارفع و اعلیٰ انسان ہے۔ اے بیوقوف۔ آ۔ میرے ساتھ چلا چل۔ تیرے لئے
دُنیا میں اس سے بڑی نعمت کیا ہے۔ کہ تجھ سے بہتر انسان بھی تیری تعریف
کریں۔ اس طرح ان سادہ لوح مسلمانوں کے منوں پھول
ضائع ہو رہے تھے۔ وہ ہار جو شب کی بیخودی میں مسل کر رہ گئے
ہوں۔ وہ پھول جو اول شام کی پرستیوں میں کچل گئے ہوں۔ وہ لڑیاں جو محبت
سے گوندھی گئی ہوں۔ اور بے پروائی سے توڑ ڈالی گئی ہوں۔ ان سب میں شراب کا
سانشہ ہوتا ہے۔ بدستی ہوتی ہے۔ بیخودی ہوتی ہے۔ کیف گناہ ہوتا ہے۔ مگر دھوکہ
اور فریب نہیں ہوتا۔ آج جو پھول گلے میں پہنے جا رہے تھے۔ ان میں خط نفس
ہی نہیں۔ فریب بھی تھا۔ پہننے والے کی خود فریبی اور پہنانے والے کی توہین

بھی تھی۔ پوجاری جب مندر میں اپنی مورتیوں پر پھول چڑھاتا ہے۔ تو وہ پھول اس کی انکسار عبودیت کا مظہر ہوتے ہیں۔ عبودیت کے طمطراق سے اس کا نفس محفوظ ہوتا ہے۔ لیکن اب کہ قومی زندگی کے چشموں کا پانی گندہ ہو گیا ہے۔ موجودہ ہنگامہ میں ظاہر پرستوں نے جوش ملی کا معیار یہ قرار دیا ہے۔ کہ بہت سے پھول ہوں۔ بہت سے ہار ہوں۔ اونچی آوازیں ہوں۔ تکبیر کے نعرے ہوں۔ جلوس کے ہنگامے ہوں۔ اور تقریروں کے دریا بہیں۔ گویا کہ قومی جدوجہد کا فرض عین ادا ہو گیا!

قومیت کا صحیح تخیل قوموں کی زندگی کا سرمایہ ہے۔ وہی انسان کے تمدن کو روم۔ ویونان۔ نینوا۔ بابل۔ بغداد۔ وائلس۔ مصر۔ ایران کی بلندیوں پر لے جاتا ہے۔ اور وہی قوموں کو فرانس۔ انگلستان۔ ڈٹلی کے عہد مکر و فریب اور دُور کیوں جاتیں خود ہندوستان میں حکومت مغلیہ کے عہد آخر کی تاریکیوں اور گہرائیوں میں گراتا ہے۔ آج ہندوستان کی قومیت کا تخیل قرآن کی الوہیت اور وید کی روحانیت کی ایک بوسیدہ تصویر ہے۔ وہ اس قدر پست ہے۔ کہ اب کسی ذرا سے قومی کام کے لئے انگلستان کا سفر بھی سزاوارہ صد تحسین و آفرین قرار پاتا ہے۔ گویا کہ جہاد کا بہترین عمل یہی ہے۔ جس کا کوئی ہندوستانی اقدام کر سکتا ہے! وہ پھول وہ ہار وہ قصیدے۔ سنائش گردوں کا وہ اجتماع۔ محبت و عقیدت کی وہ نمائش۔ سب کچھ مل گیا۔ صرف اس لئے کہ کسی شخص نے تین ہفتہ انگلستان میں رہ کر دو چار ملاقاتیں کر لیں۔ دس بیس تحریریں لکھ دیں۔ اور چند تقریروں میں اسلامی مسائل کے گھوڑے دوڑا دیئے۔ جب تخیل کی پستی کا یہ عالم ہو۔ اور نظر اس قدر محدود ہو۔ کہ پی اینڈ او کمپنی کے پانی پر تیرنے والے عشرت محل میں چند روز سفر کرنا۔ اور چند روز انگلستان و پیرس کی تہذیب و تمدن کی مینا کا رہ

سے متنع ہونا بھی ایک مجاہدہ قرار پائے۔ تو جان لیجئے۔ کہ اُس قوم کا مرض پُرانا ہے اور اب علاج محض گرمی سخن سے نہ ہوگا۔ کچھ آج نہیں۔ میرے دل میں بیخیاں اکثر آیا ہے۔ کہ آخر یہ تماشے کب ختم ہوں گے۔ تماشہ گاہ میں ہر شب کو تاج الملوک بکا دلی کے سر ہانے پہنچ جاتا ہے۔ لیکن صبح کو جب تماشہ ختم ہوا۔ تو اس تاج الملوک نے بھی رات کے رنگ و روغن کو گرم پانی سے دھو ڈالا۔ اور بکا دلی کی زگس شہلا کا سرمہ بھی بہ گیا! اس بد نصیب بر اعظم کے تماشہ گاہ میں شب و روز یہ تماشے ہو رہے ہیں۔ لمبی تانیں۔ بلند آوازیں۔ بہت سے خوب صورت ہار اور گلدستے پھولوں سے لدی ہوئی گاڑیاں اور جلوس۔ قوم کی بیداری کی روشن دلیلیں یہ ہیں! خدمت و مخدومیت کا تخیل وہ تاج الملوک ہے۔ جس نے بکا دلی کو محض خواب میں دیکھ لیا ہو۔ اور ایک کاغذ کا پھول بنا کر دکھاتا پھرے۔ کہ یہی میرا گل مراد ہے!

سمندر پر

پندرہ دن کے اس بھری سفر کی نوعیت یوں تو وہی تھی۔ جو ہر ایسے سفر کی ہو کرتی ہے۔ صبح سے شام تک جہڑوں کا چلتا رہنا۔ معدہ کا ہندوستانی ریلوں کے تھوڑا کلاس کی طرح لا داجانا۔ سمندر کی صحت بخش ہوا میں اشتہا کی شدت راستہ میں ملنے والے جہازوں کا نظارہ۔ کہیں کوئی جزیرہ نظر آجائے تو اس کا تماشہ سمندر میں کم یا زیادہ تلاطم ہو تو اپنے کمروں میں پڑا رہنا۔ اور زندگی کا ایک گونہ بے لطف ہو جانا۔ موسم اچھا ہو تو جہاز کے عرشہ پر تفریح و ورزش۔ دو چار ہمسفر کے ساتھ چہل قدمی اور گپ۔ جہاز کے مختصر کتب خانہ کی کتابوں کا مطالعہ۔ ان میں

سے کوئی چیز بھی نئی نہیں۔ کہ تفصیل کے ساتھ بیان کی جائے یا پڑھنے والوں کی معلومات میں اضافہ کرے۔ جب کسی کا پہلا بحری سفر شروع ہوتا ہے تو ہمیشہ بڑے بڑے ارادے جہاز پر ساتھ جاتے ہیں۔ سب سے زیادہ تو یہ خیال ہوتا ہے کہ سفرِ نیا اور روزِ نیا چہ تو ضرور ہی لکھا جائے گا۔ وہ ایک بڑی مفصل اور دلچسپ کتاب ہوگی جو ہندوستان واپس آکر شائع کی جائے گی۔ اور اگر دل میں ارمان زیادہ ہیں تو اس ذریعہ سے اپنی شخصیت کا اچھا خاصہ اشتہار بھی دیا جاسکے گا۔ اور اگر مفلس ہیں تو کتاب کو فروخت کر کے خالی جیب پر بھی کچھ احسان کریں گے۔ وغیرہ وغیرہ یہ ارادے تو سب کچھ ہوتے ہیں۔ اور جہاز پر پہنچ کر پہلا خیال میرا بھی یہی تھا۔ کہ کچھ نہ کچھ ضرور لکھوں۔ مگر اس کی تکمیل صرف اتنی ہی ہوئی۔ کہ کبھی کبھی ایک دو صفحے لکھے۔ اور پھر ان کو واپسی کے وقت تک نہ دیکھا اب جو ان صفحات کو لکھنے بیٹھا تو وہ پرزے بھی یاد آئے۔ جہاز کی زندگی دلچسپوں سے خالی نہ تھی۔ لیکن ان دلچسپیوں سے لطف اندوز ہونے کے لئے کالا آدمی کافی اہلیت نہیں رکھتا۔ پانی پر تیرنے والا عشرت محل جس کو عہدِ جدید کی اصطلاح میں ”جہاز“ اور کشتی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ ”سروخانہ ہمسایہ“ اور ”حسن رہ گزر“ کے تمام روح پرور کرشموں سے بھرا ہوتا ہے۔ غالب مغفور نے اس ”جنت نگاہ“ اور ”فردوس گوش“ کو دیکھا ہوتا تو ان کی ”چو گو شیعہ“ سطح سمندر کی لہروں پر رقصال نظر آتی۔ میں جو صبح سے شام تک جہاز کے ہر گوشہ میں وہ خود آرائیاں دیکھتا تھا۔ تو نظر چر کر گردن جھکا لیتا تھا۔ گویا کہ خطا وار میں ہوں! ایک دوست تو اپنے عہدِ جاہلیت کو یاد کر کے ٹھنڈے سانس کے ساتھ یوں بھی فرماتے تھے۔ کہ

عید ہوئی ذوقِ ولے شام کو

اگر نفسیات کا کوئی مبصر ان جہازوں پر سفر کرے۔ اور بشرطیکہ مقناطیسی

سے متاثر ہونے والے تمام جذبات کو مہیٹی کے ساحل پر چھوڑ آئے۔ تو وہ اس بار بردار فریب حسن میں اپنی بصیرت کے لئے ایک وسیع میدان پائے گا۔ اس ہاتھی کی طرح جس پر ریشم کے ہزاروں تھان اور جواہرات کی سیکڑوں بویاں لدی ہوئی ہوں۔ ہمارا جہاز ہزار ہا میل کا سفر کرتا ہے۔ اور مہیٹی سے لے کر عدن و سوین و پورٹ سعید و ساحل فرانس و انگلستان تک یہ گراں مایہ امانت پہنچا دیتا ہے۔ کرشموں اور تجلیوں کا وقت ہمیشہ سے وہی ہے۔ جب سورج کی روشنی باقی نہ رہے۔ یوں تو جہاز مغرب کے بعد بھی بجلی کی روشنی سے بقیہ نور بنادیا جاتا ہے۔ مگر پھر بھی عرشے کے بہت سے کونے تاریک رہتے ہیں! جب بجلی کی روشنی میں باریک ریشم کے اندر سفید جسم جھلک چکیں۔ اور کھلے ہوئے سینوں پر جواہرات اپنی دمک دکھا چکیں تو پھر تاریک گوشوں کا سکون کس قدر عزیز ہوتا ہے! شب کے دسترخوان پر جہاز کی ساری پونجی سفید کھال۔ باریک کپڑے۔ خوب صورت بال۔ درخشاں جواہرات۔ ان سب کی ڈھیریاں لگی ہوتی ہیں۔ ہر کرسی پر ایک چھوٹی سی دکان ہوتی ہے۔ اور اس دکان پر ہر قسم کی جنس رکھی ہوتی ہے۔ ایک نیک بخت کو روز دیکھتا تھا۔ کہ وہ ہر وقت اپنے کھلے ہوئے سینے کو نہایت باریک جالی کے بالشت بھر ٹکڑے سے چھپانے کی کوشش فرماتی تھیں۔ مگر وہ جالی کا ٹکڑا ہر دفعہ ان کے شانوں سے پھسل کر نیچے گرنے پر اصرار کرتا تھا۔ پس برابر بیٹھنے والے مرد کا اخلاقی فرض ہوتا تھا۔ کہ وہ اس ٹکڑے کو اٹھالے اور ان کے سڈول شانوں پر ڈال دے۔ ایک دوسری بیگم صاحبہ میرے سامنے ہی ایک میز پر تشریف رکھا کرتی تھیں۔ ان کی نازک پاپوش کا ٹکڑہ بار بار کھل جانے کا عادی مجرم تھا۔ مگر جب وہ کھلتا تھا۔ تو ہمارا ہیوں کا اضطراب قابلِ دید ہوتا تھا۔ ہر شخص دوڑتا تھا۔ کہ پہلے یہ ٹکڑہ میں لگا دوں! ایک دن ایک عجزمند

کے پاؤں میں مچ آگئی۔ حادثہ اُوپر کے عرشہ پر پیش آیا تھا۔ کوئی صورت نہ تھی۔ کہ ان کو اس حال میں کمرہ تک پہنچایا جاتا۔ آخر چند مجاہدوں میں سے ایک نے جرأت مروانہ کا اقدام کیا۔ اور گود میں اُٹھا کر اُس بار عزیز کو نیچے پہنچا دیا *

اس جلوہ گاہ میں چند پارسی اور یہودی خواتین بھی تھیں۔ جن کو اپنی یوپیٹ ہنوں سے ایک قدم بھی پیچھے رہنا گوارا نہ تھا۔ دن بھر اور رات کو بھی گیارہ بار بجے تک ان خواتین کا پر شور ہجوم عرشہ پر رہا کرتا تھا۔ شاید دنیا میں ببلٹی کے پارسی بھائیوں سے زیادہ کسی قوم کو اس قدر چیخ چیخ کر بات کرنے والی خواتین نصیب نہیں چھینا صرف آواز ہی کا فعل نہیں ہے کبھی کبھی بعض ہنوں کی وضع قطع گلا پھاڑ پھاڑ کر چمکتی ہے۔ ان کا لباس چمکتا ہے۔ ان کی نگاہیں چمکتی ہیں۔ ان کے موزوں کی باریکی اور جوتوں کی نزاکت چمکتی ہے۔ ان کی ساریوں کا رنگ چمکتا ہے جنس لطیف کا یہ ”غوغا“ باز اروں کے عامیانہ چیخ و پکار سے اکثر سننے والے اور دیکھنے والے کے لئے بہت زیادہ دلدوز اور دردناک ہوتا ہے! میرا تخیل یہ ہے کہ عورت چیخ نہیں سکتی۔ شعر چیخ نہیں سکتا۔ بول سکتا ہے! تصویر چمکتی نہیں۔ مسکراتی ہے۔ یا بسورتی ہے۔ اور اگر اس کا رنگ روغن پھینکنے لگے۔ تو پھر وہ نظر فریب نہیں! بعض اوقات ان پارسی ہنوں کا ادھلٹے شانِ نسوانیت میری نظر میں ان کو اُس شعریت سے بہت دور پھینک دیتا تھا۔ جو عورت کا صحیح مفہوم ہے۔ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ نسوانیت اس قدر بلند آہنگ ہو سکتی ہے۔ یا عورت اس طرح اپنے دہل اور نقارے بجا سکتی ہے۔ یورپ میں اس قسم کی خود نمائی سے نظر خوب آشنا ہوئی۔ وہ خود نمائی بے عیب اور بے لوث نہ تھی۔ تاہم اس میں یہ شعریت کو کیسے فنا کر دینے والا خروش بھی نہ تھا!

اسی جہاز میں ایک ہندوستانی رانی صاحبہ اور ان کی نوجوان لڑکی بھی

انگلستان جا رہی تھیں۔ اس ہنگامہ میں صبح سے شام تک وہ دونوں اپنی کرسیوں پر سب سے الگ بیٹھی رہتی تھیں۔ میں گو کہ اپنے وجود کو جہاز کی اس دنیا سے دُور پاتا تھا۔ تاہم دن میں ہر دفعہ جب رانی صاحبہ پر نظر پڑتی تھی۔ تو تخیل کا ایک عجیب ہیولہ پیش نظر ہوتا تھا۔ ایک طرف یورپ کے تمدن و معاشرت کے تمام مصنوعات اور نقاشیوں کو دیکھتا تھا۔ چھٹی ہونی (ناظرین میری اس اصطلاح سے درگزر فرمائیں) نسوانیت سے اکتایا اور بعض اوقات جھنجھلایا کرتا تھا۔ اور دوسری طرف ہندوستان کی ایک عورت اور لڑکی پر نظر جاتی تھی۔ جو اس فریب نظر میں گھری ہوئی تھیں۔ تاہم اس سے دُور تھیں۔ بے پردہ تھیں۔ مگر پردہ میں تھیں۔ بے نقاب تھیں۔ مگر نقاب میں تھیں۔ جیسا کہ مفہوم اگر کچھ ہے۔ تو اب بھی ہندوستانی عورت کے وجود روحانی میں موجود ہے۔ ازراہ تعصب نہیں کہتا۔ یورپ کے بہت سے اوصاف کا معترف ہوں۔ مگر یہ جو ہر تہذیب و تمدن اُن بازاروں میں بہت کمیا ہے۔ جب اس ہنگامہ میں رانی صاحبہ کو دیکھتا تھا تو اپنے دماغ میں پاکیزہ نسوانیت کی ایک عجیب تصویر پاتا تھا۔ جس کی ایک جھلک بھی یورپ کے مبصرین نفسیات نہیں دیکھتے۔ وہ محض فریب نظر کے مجروح ہیں ایک شب عرشہ پر نالچ ہو رہا تھا۔ رانی صاحبہ بھی ایک گوشے میں اپنی کرسی پر بیٹھی ہوئی محفل کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔ میں ایک طرف کھڑا سوچتا تھا۔ کہ یورپین نسوانیت کی یہ تصویریں جن پر دُنیا بھر کے فنون لطیفہ صرف ہوتے ہیں۔ انسان کے محسوسات عالیہ سے کیوں دور رہتی ہیں۔ یورپ کی عورت شب کے لباس میں جو اس کے لئے زیب و زینت کا مقطع ہے۔ گردن سینہ کے انتہائی حدود تک کھلی ہوئی۔ بازو بغلوں سے اُوپر تک برہنہ مرد کے اعلیٰ تخیل کو مس کرنے کی بجائے درحقیقت اس کی مادیت کو متحرک کرتی ہے۔ اور ایک دُنیا ہے

کہ اس سحر کاری پر مٹی ہوئی ہے۔ برخلاف اس کے ہندوستان کی عورت۔ تعلیم و تمدن و معاشرت میں چاہے اپنی یورپین بہن سے دو قدم آگے بڑھ جائے۔ چاہے وہ اپنے لباس میں آداب حجاب و حیا کی پوری پابندی نہ کرتی ہو۔ لیکن آنکھ میں غرور و سوانیت۔ وہ نمکین حیا پھر بھی محفوظ رکھتی ہے جس کا وجود یورپ میں عام طور پر نظر نہیں آتا۔ تعصب نسل و مذہب سے قطع نظر میں نے تو یورپین اور ایشیائی عورت کی تصویروں کو جب دیکھا۔ قلب نے گواہی دی۔ کہ آنکھ اگر روح کا آئینہ ہے۔ تو اس ذریعہ سے کالی عورت کی اعلیٰ روحانیت صاف نظر آسکتی ہے۔ ایک موٹی میم صاحبہ کو (غالباً فرانسیسی تھیں) ہر روز دیکھتا تھا۔ کہ وہ دن میں دو دو دفعہ لباس تبدیل فرما کر تشریف لاتی تھیں۔ ہر شام کو ان کے لباس میں جدت طرازیوں کا گونا گون اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ بیچاری وزن میں شوکت علی صاحب سے کم نہ ہوں گی۔ جسم نازک پر لباس فاخرہ کا ٹانکا اپنے میں تاب و متادمت نہ پا کر اور اس کھمکش سے تنگ آکر جو جسم کی ہر حرکت سے اسکے اندر پیدا ہوتی تھی۔ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر چھینتا تھا۔ صحت جسمانی ماشا اللہ ایسی تھی کہ ہم سے دائم المریض رشک کریں۔ اُس دبیر جسم نے سوانیت کی لطافت و نزاکت کو بالکل دبا لیا تھا۔ تاہم وہ جب شب کے نہایت باریک کپڑے پہن کر نکلتی تھیں۔ تو ازراہ غایت انکسار اپنے کو پری سے کم نہ سمجھتی تھیں! قدم اٹھاتی تھیں۔ تو نظر ہر طرف دوڑتی ہوتی تھی۔ کہ کسی نے دیکھا یا نہیں۔ موٹی کمر لچک دے سکتی تھی۔ مگر پھر بھی لچکانی جاتی تھی پنچوں پر چلنے کی کوشش کی جاتی تھی۔ کہ یہ بھی ایک ادا ہے۔ لیکن جسم نازنین کا وزن لکڑی کے فرش کو تھرا دیتا تھا!

یہ تو حال تھا۔ لیکن نظر فریبیوں کے زخم نصیب یہاں بھی حاضر تھے

یہ کیا ہے؟ سوانیت کا کیسا ادنیٰ تخمیل ہے! غرور و سوانیت کی کیسی بھدی تصویر

ہے! وہ غرورِ نسوانیت جس کا سارا سرمایہ جسم کی سفید کھال۔ خوشبودار پوڈر اور باریک ریشم ہو۔ یقیناً جانئے کہ اس نسوانیت کی روح گم ہو گئی ہے! یہ کاغذ کی جاپانی قندیلیں ہیں۔ جن کے اندر موم کی پتی گل ہو چکی ہے۔ اور خالی قندیلیں ہوا میں جھول رہی ہیں! لیکن کم نظر روشنی کے طالب نہیں۔ بلکہ قندیل کاغذ خوب صورت چلتے ہیں!

فریبِ حق اور خود بینی کے ان نمونوں کا ذرا اس کالی رانی سے مقابلہ کیجئے۔ جو دولت میں شاید تمام یورپین بہنوں سے زیادہ ہوگی۔ ثروت و جاہ دُنیا کے لحاظ سے اس جہاز پر اُس کا ہم پلہ کوئی نہ تھا۔ تعلیم و تہذیب و تمدن و معاشرت میں وہ لندن و پیرس کے بہترین نمونوں کے دوش بدوش تھی۔ تاہم چشمِ حقیقت ہیں گواہی دیتی ہے۔ کہ وہ سب سے مختلف۔ الگ دُور۔ اور بلند تھی! دن کا اکثر حصہ عرشہ پر گزرتا تھا بارہا ان "کالی" ماں بیٹیوں پر نظر جاتی تھی۔ اور قلبِ پکار اٹھتا تھا۔ کہ اگر قوموں کی کامیاب زندگی کے لئے عورتوں کی فطرتِ عالی اور خصائصِ حسنہ کی شرط لازمی ہے۔ تو پھر میری قوم کا مستقبل ان کالی عورتوں کے ہاتھ میں محفوظ ہے۔ وہ کچھ ہی ہو جائیں۔ مگر ان کی فطرت آلودہ نہیں!



عدن

پانچویں دن ہمارا جہاز عدن پہنچا۔ بہت سے تجارت پیشہ مسلمان اور ہندوستانی جو یہاں مقیم ہیں، جہاز پر ہم لوگوں سے ملنے آئے۔ چونکہ جہاز تین چار گھنٹہ قیام کرنے والا تھا۔ اس لئے یہ اصحابِ ہم کو بہ اصرار شہر میں لے گئے میری عمر میں یہ پہلا موقع تھا۔ کہ مجھے اس سرزمینِ پاک پر قدم رکھنا نصیب ہوا۔

جس کا ایک ایک ذرہ ہر مسلمان کو عزیز ہے۔ کاش کہ انگلستان کے یہ مسافر جو نام نہاد پیروان مسیح کی بارگاہ میں انصاف مانگنے جا رہے تھے۔ ایک دفعہ اُس دروازے پر بھی جاتے۔ جو تیرہ سو برس سے ایک عالم کے لئے باب رحمت ہے۔ اور آج ہم سیہ بختوں کے عہد میں ایک غاصب اُس کی چوکھٹ پر بیٹھا ہوا تمام دیرینہ عظمت اسلامی کا خون کر رہا ہے۔ جس حرم رسالت میں ایک دُنیا آنکھیں بچھاتی ہے۔ وہاں آج اُس غاصب کی ہوساکیوں نے یہ حال کر دیا ہے۔ کہ سحر افرش بھی میسر نہیں! کبھی ہندوستان کے بد بخت مسلمانوں کو اتنی توفیق بھی ہوئی۔ کہ وہ ارض مقدس کے ان انقلابات پر ایک نظر کرتے۔ اور اپنی رگوں میں اسلاف اسلامی کی عصیت کو متحرک پاتے! شہر عدن میں جا بجا حبشیوں کے گھر نظر آتے ہیں۔ گھروں کے دروازوں پر خوب صورت بکریاں بندھی ہوئی دیکھیں۔ چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھیلتے ہوئے پاپا۔ مگر فارغ البالی اور خوش حالی کے آثار نظر نہ آئے۔ میں سوچتا تھا۔ کہ عدن کے ان حبشی باشندوں میں کتنے ہیں۔ جن کو بلال کی وراثت سے ایک ذرہ کا لکھواں حصہ بھی نصیب ہوا ہو۔ آج اے حبش۔ کہ اسلام کے سب سے پہلے مہاجرین نے تیرے ریگستانوں کو آباد کیا۔ آج تو بلال کو بھی نہیں جانتا! عدن کے کوچہ بازار میں حبشی بہت سے تھے۔ مگر میری آنکھیں اُس "بلالیت" کو ڈھونڈ سکتی رہیں۔ جو وہاں نہ تھی۔ بلال مبالغہ سیکڑوں حبشی اور سیاہ فام عرب دیکھے۔ کہ وہ شہر سے ساحل تک اور ساحل سے شہر تک مسافروں کے ساتھ بھاگتے ہوئے آتے تھے شاید کہ ایک پیسہ مل جائے! جب ان کے ہاتھ خیرات لینے کے لئے بڑھتے تھے۔ تو میں آسمان کی طرف دیکھتا تھا۔ کہ اے کارساز! یہ ہاتھ جو آج خیرات لینے کے لئے بڑھ رہے ہیں۔ کیا وہی ہاتھ ہیں۔ جو صدیوں تک دینے کے لئے

بڑھا کرتے تھے؟ یہی ہاتھ تھے جو اس ارض پاک کی حرمت کا جھنڈا لے کر
الکاف عالم میں ڈنکے بجا آئے؟ دُنیا میں طوفان لانے والے آج کیوں دُنیا
کے طوفان میں غرق ہیں؟

اے دُر تابندہ اے پروردہ آغوش موج

لذت طوفان سے ہے نا آشنا دریا تر!

دامن عربستان کے ان دھبوں کو دیکھ کر دل کے ٹوٹے ہوئے تاروں میں
ایک جھرجھراہٹ پیدا ہوئی۔۔۔ غم کی ایک ٹوٹی ہوئی تان کچھ نکلی اور کچھ گھٹتی
بہت سے دولت مند عرب بھی دیکھے۔ جو اپنی موٹروں میں اڑے پھر رہے
تھے۔ کیا یہ بھی عہد نبوت کے ان شتریانوں کی نسل ہے۔ جو ناقہ رسالت کی
دُوری پکڑ کر چلتے تھے؟ کیا وہ بھی طارق کی چھوٹی کشتیوں میں سوار ہونے
والوں کے اخلاف ہیں جو جہاز کے سامنے پانی میں غوطے لگا رہے تھے کہ
شاید کوئی مسافر ایک پیسہ پھینک دے!

معلوم نہیں عدن کی پہاڑیوں کے دامن میں پانی کے حوض کس نے
بنائے تھے جن کو آہمار تاریخی کا جو یاں سیاح دیکھنے جاتا ہے۔ کوئی کہتا ہے۔
کہ یہ حوض ایرانیوں کے بنائے ہوئے ہیں۔ کوئی کہتا ہے۔ کہ عربوں کے کسی
پُر نے قبیلہ نے صدیوں پہلے ان حوضوں کو تیار کیا تھا۔ تاکہ پہاڑوں کا
پانی ان کے اندر جمع کیا جاسکے پس نے بھی جا کر دیکھا۔ آج یہ حوض خشک
پڑے ہیں۔ پہاڑ بھی خشک ہیں۔ اور ان کے چشمے بھی بے آب ہیں۔ لایق
کہ عدن کے تمام چشمے خشک ہیں۔ پانی کے چشموں کا کیا ذکر عرب کی انسانیت
کے چشمے بھی خشک ہیں۔ اور جہاں کچھ پانی ہے۔ تو اس کو بھی گندی مچھلیوں
نے گندہ کر دیا ہے!

ایک دوست نے اس مسودہ کو دیکھ کر کہا کہ تو نے سیٹھوں کی دعوت کا تو کچھ حال بھی بیان نہ کیا۔ لہذا گزارش ہے کہ دعوت خوب تھی۔ یہ نہ سمجھ سکا کہ محض چاء کی دعوت تھی۔ یا ضیافت شب۔ یا دونوں کا مرکب تھا۔ غرض جو کچھ تھا۔ میرے لئے یہ صدمہ کافی تھا۔ کہ کچھ کھانہ سکا۔ وقت کم تھا۔ اور مجھے اس دعوت کی خبر ہندوستان کے اخبارات کو بذریعہ تار روانہ کرنی تھی! دعوت کھانے سے زیادہ اُس کی خبر کا شایع کرنا ضروری تھا! اس لئے کہ کھانا اور کھانا سب بے کار ہے۔ اگر کھانے والے کے کھانے اور کھلانے والے کی کھلانے کا حال دُنیا پر روشن نہ ہو جائے! تمدن اور مہذب زندگی کے لئے یہ بھی منجملہ شرائط لازمی ہے سیٹھ چھوٹا بی صاحب کو بہت تردد تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ضیافت کا پورا حال ہندوستان کو معلوم نہ ہو سکے۔ اور وفد کی قومی خدمات کی یہ سہ ماہی تفصیل کیسے اخبارات تک نہ پہنچے!

سلسلی (مستقلہ)

جب ہمارا جہاز ایک دن صبح عظمت اسلامی کے اس مزار کو مس کرتا ہوا گزرا۔ جس کو اب جزیرہ سلسلی کہا جاتا ہے۔ تو وہ لمحہ رقت قلب۔ عبرت مند و شرم اور غیرت کا ایک عجیب لمحہ تھا۔ جس نے دل کے بے صدا تاروں کو پھر دفعتاً ایسا کھینچا۔ کہ میں مبہوت رہ گیا۔ (اور کون مبہوت نہ رہ جاتا) ان تاروں میں برسوں کے بعد نہ جانے کہاں سے ایک جھرجھراہٹ سی پیدا ہوئی! میں شاعر نہیں۔ میرے حیاتِ قلم کے قلوب میں بہت کم آتے ہیں۔ نہ زبان ان کو سنبھال سکتی ہے۔ تاہم اس سارے افسانہ کا وہی ایک ورق تھا جو میں نے

اس گہوارہ سطوتِ اسلامی کے سوا حل کے سامنے بیٹھ کر لکھا۔ اور اپنے بساط کے مطابق بُرا نہیں لکھا۔ اسپین کے نشانات تو ابھی دیکھے نہیں۔ الحمراء اور قرطبہ کے در و دیوار ہنوز ایک تصویر خیالی ہیں۔ لیکن اس بجھے ہوئے چراغِ بگڑا کو دُور سے دیکھ لیا۔ اور اپنے آنسوؤں اور آہوں کا تحفہ اُس خاک پر پیش کر دیا۔ جس نے قرونِ اعلیٰ کے ان دستِ نورِ دوں کے قدم چومے تھے۔ جن کے کفنِ قیامت تک میلے نہ ہوں گے! وہ ورق جو میں نے اس ایک "عالم" میں لکھا تھا۔ کسی دوست کی عنایت سے اس مسودہ میں باقی نہیں۔ میں اب اس کے لکھنے کے لئے زندگی کا وہ عجیب لمحہ کہاں سے پاؤں ناچار یہ چند سطریں لکھ رہا ہوں۔ جن میں وہ درد بھری موسیقی نہیں ہے۔ جو کبھی کسی ساز سے کسی تار سے خود ہی نکلا کرتی ہے۔ اور پھر اس ناقدرِ شناس دنیا سے غائب ہو جاتی ہے۔ انسان چاہے کہ پھر اُسی تار کو چھیڑے اور وہی ہی آواز پیدا کر لے۔ ممکن نہیں۔ غرض میں نے تاریخِ اسلامی کے اُس ایک ورق کو جو کجرا و قیانوس کے سینہ پر پڑا ہوا ہے۔ چند گھنٹے خوب دیکھا۔ جب تک جہاں اس محل کے قریب رہا۔ میری نظریں اس خاکِ پرچی میں اُلپیں کتنا تھا۔ کہ الہی! اس ورق پر اس عمدہ رفتہ کا لکھا ہوا کوئی ایک حرف بھی کہیں باقی ہوگا۔ ان آبادیوں میں۔ ان پہاڑیوں کے دامن میں۔ ان چٹانوں پر کہیں بھی کوئی نقش باقی ہوگا۔ جس پر کوئی صاحبِ نظر سجدہ کرے! سنتا ہوں کہ اب کچھ باقی نہیں! جب اُٹلی گیا تو یہ خیال آیا۔ کہ لاؤ ایک دن کے لئے اس اُجڑے گھر کو بھی جادو کیجیے۔ لیکن بتانے والوں نے بتایا کہ وہاں اب کوئی نشان باقی نہیں۔ کوئی نام باقی نہیں! کاش کہ اقبال مجھے اپنی اس کیفیت کا ایک لمحہ دے دیتے یا دے سکتے۔ جس نے ان سے کبھی وہ نوحہ لکھوایا تھا۔

رکھا جانے اب بارگاہ حکومت سے ”سمرقراز ہو کہ ہندوستان کے اس بلبیل ناکش
کی موسیقی اب ہم کیسے سنیں گے۔ جسکی موسیقی صرف ایک دل گداختہ ہی سے پیدا ہو سکتی ہے
روئے اب دل کھول کر اسے دیدہ خونناہ بار۔ وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
یہ محل خیمہ تھا ان صحرائے نشینوں کا کبھی۔ بحر باز یگاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے دربار نہیں تھے۔ شعلہ جانشوز پنہاں جن کی تلواروں میں تھے
آفرینش جن کی دُنیا کے کن کی تھی اجل۔ جن کی ہیبت سے لرز جاتے تھے ہل کے محل
زندگی دُنیا کو جن کی سوزش قم سے ملی۔ مخلصی انسان کو زنجیر تو ہم سے ملی
جنگلے آواز سے سے لذت گیر اب تک گوش ہے۔

وہ جس اب کیا ہمیشہ کے لئے خاموش ہے؟

آہ لے سلی! سمندر کی تھی تجھ سے آبرو۔ رہنما کی طرح اس پانی کے صحرا میں ہے تو
زیب تیرے خال سے رخسار دریا کو رہے۔ تیری شمعوں سے تسلی بھر پیا کو رہے
ہو سبک چشم مسافر پر ترا منظر مدام۔ موج رقصاں تیرے ساحل کی چٹانوں پر مدام
تو کبھی اُس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسن عالم سوز جس کا آتشیں نظارہ تھا۔

نالاکش شیراز کا بلبیل ہوا بغداد پر۔ داغ رویا خون کے آنسو جہاں آباد پر
آسمان نے دولت غرناطہ جب برباد کی۔ ابن بدرو کے دل ناشاد نے فریاد کی
مرثیہ تیری تباہی کا مری قسمت میں تھا یہ تڑپنا اور تڑپانا مری قسمت میں تھا
ہے تیرے آثار میں پوشیدہ کس کی داستان۔ تیرے ساحل کی خموشی میں ہے اندازِ بیان
درد اپنا مجھ سے کہہ میں بھی سراپا درد ہوں۔ جسکی تو منزل تھا میں اُس کا روانگی گرد ہوں
رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دیکھے۔ قصہ ایام سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے
میں ترا تحفہ سوے ہندوستان لے جاؤں گا۔

خود یہاں روتا ہوا اوروں کو دماں رلواؤں گا۔
 واپسی کے وقت ہمارا جہاز شب کی تاریکی میں سسلی کے قریب گزرا۔ آدمی
 رات گزر چکی تھی۔ جہاز کی ساری آبادی غافل سو رہی تھی سوتے سوتے میری
 آنکھ کھلی۔ کمرہ کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ میں نے ایک خواب دیکھا۔ ایک طرف
 سمندر میں دور تک تیز روشنیاں نظر آئیں۔ اور وہ سماں اس وقت بہت
 ہی عجیب معلوم ہوا۔ واقعی میں یہ سمجھا۔ کہ خواب دیکھ رہا ہوں۔ لیکن نیند کا
 نشہ کچھ کم ہوا تو بجلی کی وہ روشنیاں سسلی کے ساحل پر نظر آئیں۔ جہاز
 عموماً ساحل سے اس قدر قریب گزرتا ہے۔ کہ دن کی روشنی میں شہر کے
 مکانات۔ سڑکیں۔ حتیٰ کہ آدمی چلتے پھرتے صاف نظر آتے ہیں۔ شب
 کی تاریکی میں یہ تو کچھ نہ تھا مگر بجلی کے چمکتے ہوئے قمقموں نے مجھے ہندوستان
 کا ایک گورستان یاد دلایا۔ جہاں میں نے ایک دفعہ ایک عجیب تماشہ دیکھا تھا۔
 ہم لوگ رات کو ۱۲ بجے ایک دوست کو دفن کرنے شہر کے باہر ایک پرانے
 قبرستان میں گئے۔ بیس پچیس آدمی تھے۔ اور دو تین لالٹینیں ساتھ تھیں قبرستان
 بہت وسیع اور بہت پُرانا ہے۔ ہم ہنوز دفن سے فارغ نہ ہوئے تھے۔ کہ قبرستان
 کے ایک کونے میں بہت سی روشنیاں (جیسی مشعلیں جلتی ہوں) نمودار ہوئیں
 رفتہ رفتہ اُن کی تعداد بڑھتی گئی۔ اندھیری رات میں مشعلیں اس طرح روشن نظر
 آئیں۔ کہ ہم سب بہت ہی خوفزدہ ہوئے۔ تاہم وہ خوف اس قسم کا تھا۔ کہ سب
 کی آنکھ کی طرح اُن روشنیوں کی چمک نے ہماری نظروں کو مسح کر لیا۔ ڈرتے
 جاتے تھے۔ مگر نہ بھاگنے کی ہمت تھی نہ منہ پھیر سکتے تھے۔ سوائے روشنیوں کے
 کوئی چیز نظر نہ آتی تھی۔ یہ تماشہ تقریباً آدھ گھنٹہ تک رہا۔ اس کے بعد مشعلوں
 کا وہ جلوس آہستہ آہستہ گورستان کے ایک دوسرے گوشہ کی طرف جا کر غائب

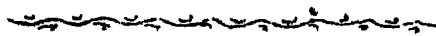
ہو گیا۔ اے فلسفی! تو کیا کہتا ہے؟ اے ماہر سائنس! تیرا نظریہ کیا ہے؟ اے
 ملا! تو کیا سمجھتا ہے؟ اے حکیم! تو نے کیا سوچا! اور اے صوفی! تو کیا دیکھتا ہے؟
 غرض اس شب کو صقلیہ کی روشنیوں نے مجھے وہی قبرستان والا
 سماں یاد دلایا۔ اور صبح تک دل اور دماغ باہم جھگڑتے رہے!

یہ سب کچھ تو کہا۔ مگر قلم روکتا ہوں۔ تو دل کہتا ہے۔ ایک تسلی ہی کے لئے
 کیا روئے گا! یہاں تو سارا سمندر ایک اشک حسرت ہے! یہی تو وہ بحر اوقیانوس
 تھا۔ جسکے ساحل پر سپہ سالار اسلام۔ فلخ افریقہ۔ عقبہ ابن نافع نے بچپن ہو کر
 گھوڑا پانی کے اندر ڈال دیا تھا۔ اور اپنی تلوار کو بے نیام کر کے کہا تھا۔ کہ خدایا
 اگر مجھے یہ سمندر نہ روک لیتا۔ تو مغرب کی طرف بڑھا چلا جاتا۔ اور تیرے نام پاک
 کی کبریائی کا وہاں بھی اعلان کرتا اور اُن لوگوں کو تیری طرف راستہ دکھاتا جو
 دوسروں کو پہنچتے ہیں، قیروان کا نامور بانی خود آگے نہ جاسکا۔ لیکن آنے
 والی نسلیں اسلام کا نام لے کر سمندروں میں گھس گئیں۔ اور آج ان ناپید اکنار
 دریاؤں کی گہرائیوں میں جادھر جا ہے اسلام کے ان فاتحین کا نقش قدم دیکھ
 بیٹھے۔ میں ابھی تسلی کو دیکھ دیکھ کر اقبال کا نوحہ پڑھ رہا تھا۔ دو ہی دن بعد
 ہمیں جزیرہ سارڈینیا کے پہاڑوں کی بلند چوٹیاں نظر آنے لگیں۔ یہ جزیرہ
 بھی کبھی سلطنت روم کے طاقتور پنجے سے نکل کر پرچم اسلامی کے سایہ میں آیا
 تھا۔ خبر نہیں وہاں بھی عہد اسلامی کے کچھ آثار باقی ہیں یا نہیں۔ باقی ہوں
 یا نہ ہوں۔ نام تو باقی ہے۔ بہت سے جہاز اس سمندر میں گزرتے ہیں۔
 ان جہازوں پر ہزاروں مسلمان خلاصی اور سیکڑوں مسلمان مسافر
 بھی گزرتے ہوئے لیکن کتنے ایسے ہیں جن کو یہ خبر ہے۔ کہ اس سمندر کے

پانی میں فدا یتیان اسلام کا کس قدر خون ملا ہوا ہے! رونے کو نہیں کہتا۔ رونے کا قاتل نہیں۔ مگر یہ ایک درس عبرت ہے! آنکھیں کیوں بند کیجئے۔ ہاں مگر غریب ہندوستان والے کیا کریں۔ یہاں مدرسوں میں پتولین۔ گرامول اور نلن کے سوا ہے کیا۔ انہیں کیا معلوم کہ بحر اوقیانوس میں بھی کبھی اونٹ والے گھس جایا کرتے تھے! وہ آرمیڈا کے نام سے تو واقف ہیں۔ مگر عقبہ ابن نافع کے گھوڑے اور طارق کی کشتیوں کا حال انکو کیونکر معلوم ہوا! خلائی کا اصلی زہر یہ ہے! پھر کیا تعجب ہے۔ کہ یہ غافل دنیا میں جدھر جاتے ہیں۔ اپنی زندگی کو تلخ پاتا ہے!

باہم تبادلہ خیالات

عدن کے بعد سفر کا باقی زمانہ بھی معمولی مشغلوں میں گزرا۔ پورٹ سعید یورپ کا ڈانڈا ہے۔ یہ مقام (گو میں خود شہر میں نہ جاسکا مگر سنتا ہوں۔ کہ) یورپ کی اپنی زندگی اور اخلاقی پستی کی ایک اچھی نمائش گاہ ہے۔ جہاں مشرق سے آئینوالا مسافر سب سے پہلے مغرب کے بدترین عناصر سے دوچار ہوتا ہے۔ بازاروں میں وہی ہنگامہ آرائیاں اور عشوہ فروشیاں ہیں۔ وہی عیش پرستی اور بدستی ہے۔ وہی دولت کی سحر کاری ہے۔ وہی تموہ خانے اور تھیشٹر ہیں۔ اور اخلاقی زندگی کی وہی بے اختیاریاں ہیں جن کا تماشہ ہم نے یورپ کے سفر میں قدم قدم پر دیکھا۔ پس مارسیلز تک بقیہ سفر کے حالات سے قطع نظر کرتا ہوں +



مارسیلز و پیرس

۵ مارچ کی صبح کو ہمارا جہاز مارسیلز پہنچا۔ اسی دن شام کو ہم پیرس کی طرف روانہ ہو گئے۔ مارسیلز میں فرانسیسی زندگی کا پہلا نظارہ دیکھا۔ پیرس میں دو دن قیام رہا۔ اور مارسیلز کی ایک جھلک میں جو کچھ دیکھا۔ اس کی تھوڑی سی تفصیل پیرس میں نظر آتی۔ تاہم چونکہ جلد سے جلد لندن پہنچنا ضرور تھا۔ اس لئے یہ طے کیا۔ کہ واپسی کے وقت پیرس کو اچھی طرح دیکھ لیں گے۔ ڈاکٹر نہاد رشاد جو حکومت انگلوراکے نمائندے ہیں۔ اور جن کا نام ہم محمد علی سے سن چکے تھے۔ پیرس میں موجود نہ تھے۔ بلکہ لندن میں تھے۔ البتہ خلیل خالد بے (جو ایک زمانہ میں ہندوستان میں ترکی سفیر کی حیثیت سے رہتے تھے) وہاں موجود تھے۔ ان کے علاوہ چند دوسرے ترک احباب سے بھی ملاقاتیں ہوئیں۔ موسیو والدہام ایک ترکی النسل مسلمان ہیں۔ مگر فرانس میں زیادہ رہنے کی وجہ سے اچھے خاصے فرانسیسی ہو گئے ہیں۔ اسلام کے بڑے ہرجوش فدائی ہیں۔ میں نے اس سفر میں جو کچھ حاصل کیا۔ اس میں سب سے زیادہ موسیو والدہام کی محبت و دوستی ہے۔ جس کا نقش ہمیشہ میرے دل پر باقی رہے گا۔ تصنع سے پاک۔ ہر وقت اسلامی خدمات انجام دینے پر آمادہ و تیار۔ ایسے خاموش کام کرنے والے بہت کم ملتے ہیں۔ اس زمانہ میں صاحب موصوف قوم پرست ترکوں کے اخبار ایگلوڈمی اسلام کے اڈیٹر تھے۔ جو پیرس سے ہفتہ وار شائع ہوتا ہے۔ دو دن کے مختصر مقام میں ہم دونوں نے ایک دوسرے کو پہچان لیا۔ اور آئندہ کے لئے ایسے باہمی مراسم کی بنیاد قائم ہوگی۔ جو مجھے بہت عزیز ہیں۔ یورپ کے اخبار نویسوں سے پہلا واسطہ پیرس میں پڑا۔ میں غریب ہندوستان

کا اخبار نویس اُن لوگوں کے عزم اور کوشش کو دیکھ کر حیران رہ جاتا تھا۔ صبح سے شام تک وہ ہوٹل کو گھیرے ہوئے تھے۔ کہ اگر ملاقات نہ ہو تو آتے جاتے کسی کالے آدمی کی ایک تصویر ہی کھینچ لیں۔ سیٹھ چھوٹانی صاحب نے اخبار نویسوں کے نمائندے کو ایک مختصر بیان بھی دیا۔ جس کو دوسرے ہی دن اخبار مذکور نے حسب ذیل الفاظ میں شائع کر دیا:-

”مسٹر چھوٹانی پریذیڈنٹ سنٹرل خلافت کمیٹی کو جو ایک بہت بڑے سوداگر ہیں۔ اور تحریک خلافت کے لیڈر ہیں۔ برطانوی وزیر اعظم نے مشرق قریب کی کانفرنس کے سلسلہ میں طلب کیا ہے“

جب دوسرے دن ہم لوگ روانہ ہونے لگے۔ تو اسٹیشن پر بھی اخبار نویسوں کا ایک اچھا مجمع تھا بہت سے فوٹو گرافر بھی ان کالے آدمیوں کی تصویر لینے کے لئے تیار آئے تھے۔ ہم سب بلا ہلا کر کھڑے کئے جاتے تھے۔ اور بار بار کھینچے جاتے تھے۔ میں اپنے احباب کی اداؤں میں محو تھا۔ کوئی صاحب جلدی جلدی ثانی درست کر رہے ہیں۔ اور ساتھ ہی کوٹ کی آستینوں پر بھی نظر ہے مگر گوشہ چشم سے یہ بھی دیکھتے جاتے ہیں۔ کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ کوئی صاحب مونچھوں کی نوک کو صحیح اور مناسب زاویہ پر قائم کرنے کی سعی فرما رہے تھے۔ کوئی بزرگ اپنے چہرہ پر ایک گہرے تدبر کی شان پیدا کرتے تھے۔ ایک دوست کچھ نہیں تو ایک سنجیدہ مسکراہٹ کا نقش لبوں پر ثبت کرنا چاہتے تھے۔ غرض یہ کوششیں قابل دید تھیں! پھر لندن میں وہ انتظار کہ فرانسیسی اخبارات آئیں تو ان میں اپنی تصویریں دیکھیں! مگر یہ نہ سمجھتے۔ کہ اس میں خود بینی و خود نمائی کو ذرا بھی دخل تھا۔ اس قسم کے عامیانه جذبات برطانوی وزیر اعظم کے معزز مہمانوں کی شان کے شایاں کب تھے۔ یہ تو سب خلافت کے لئے ”پروپیگنڈا“ تھا۔

اس شہرت و نمود کا مقصد تو بیحد نیک اور سعید تھا یعنی کہ یہ نمائش خلافت کے کام میں شخصیتوں کو زیادہ موثر اور وزنی بنادے! پس جو کوئی اعتراض کرنے کا ارادہ فاسد رکھتا ہو وہ اپنی زبان بند رکھے!

کیلے سے دو وز تک پھر ایک چھوٹے سے اسٹیم میں سفر کرنا پڑا۔ اور گو یہ اندیشہ تھا کہ حسب معمول آہنا سے متلاطم ہوگا۔ لیکن بہت آرام سے گزر گئے اور ماچ کی شام کو بعد مغرب سلطنت برطانیہ کے دارالسلطنت کی دم گھونے والی سرد تاریکی میں جا پہنچے۔ اسٹیشن پر احباب کا ایک بڑا مجمع ہمارا منتظر تھا۔ مسٹر شعیب قریشی۔ اور عبدالرحمن صدیقی جن سے ملنے کی خوشی نے سفر کی تمام کلفتوں کو دل سے بھلا دیا تھا۔ موجود تھے۔ ترکی دود کی جانب سے ہزاریکسلسنی جامی بے اور ڈاکٹر نہادر شاد اسٹیشن پر تشریف لائے تھے۔ اور اس خاص ہرادا محبت سے ملے۔ جس سے باوجود مسلسل مصائب و آلام ترکوں کی فطرت کبھی خالی نہیں ہو سکتی۔ لندن کے اکثر احباب مسٹر اصفہانی۔ مسٹر ملک۔ مسٹر حسین وغیرہ کو بھی اسٹیشن پر پایا۔ دوستوں نے پہلے ہی سے ایک اچھا مکان تجویز کر لیا تھا۔ اور ہماری جماعت (جس میں سے میں نے اور سیٹھ چھوٹانی صاحب نے تو پہلی دفعہ لندن کی سرزمین پر قدم رکھا تھا) قیام گاہ پر پہنچ گئی۔

مسٹر حسن امام اور ہزہائیس سر آغا خاں صاحب نے مارسیلز سے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ اور وہ ایک دودن پہلے ہی لندن پہنچ چکے تھے۔ اور غالباً وزیر ہند سے مل بھی چکے تھے۔ اب کہ سب لوگ لندن میں یکجا ہو گئے۔ پہلی فکر یہ تھی کہ بارگاہ وزارت عظمیٰ سے یہ پتہ چلے۔ کہ آخر یہ غلام غلاماں کیوں طلب فرمائے گئے ہیں۔ ایک عرصہ کی بے اعتنائیوں اور بے نیازیوں کے بعد ان تو جہات کریمانہ کی ضرورت کیوں پیش آئی مجھے اس سفر میں غالب مرحوم کا وہ شعر اکثر

یاد آیا کرتا تھا۔ کہ

ہم تک نہ اُس کی بزم میں آتا تھا دور جام
ساتی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں !
لیکن ہنر ہائیس سر آغا خان اور سید حسن امام صاحب سے وزیر ہند کے متعلق
بے حد اُمید افزا افسانے سنے تھے۔ اور کبھی کبھی یہ واہمہ پیدا ہوتا تھا۔ کہ شاید
کہ ہمیں بیضہ برادر پروبال ؟

لندن

چلا ہے ادولِ راحت طلب کیوں شادماں ہو کر
زمین کو سے جاناں رنج دے گی آسماں ہو کر
برطانیہ عظمیٰ کے دار السلطنت کا پہلا نظارہ میرے دل پر سوائے اس کے
کوئی اثر نہ کر سکا۔ کہ ایک کالا آدمی اس سرزمین آزادی و حریت میں بھی غلاموں
کی حیثیت رکھتا ہے۔ جو قوم دعویٰ کرتی ہے۔ کہ اس نے ۱۹ ویں صدی عیسوی
میں دنیا سے غلامی کا نام و نشان مٹا دیا۔ اس کی سلطنت کے ہر چہ پر اقتصاد
معاشرتی۔ تمدنی اور سیاسی غلامی کی بدترین کیفیات اہل نظر کے لئے عبرت آموز
ہیں۔ غلامی کا کریہ منظر دیوتا طاقت اور مادیت کے ہر مندر اور شوالہ میں بدستور
موجود ہے۔ سوائے اس کے۔ کہ اب اُس کو زیادہ خوش آئند اور نظر فریب
لباس پہنا دیا گیا ہے۔ اس سرزمین حریت میں نے ہر قدم پر اپنی غلامی کے
نشان دیکھے۔ سڑکوں پر۔ ہوٹلوں میں۔ باغوں میں۔ ریل میں۔ جہاز پر۔ وزارت
ہند کے شاندار دفتر میں۔ وزیر اعظم کے ایوان حکومت میں۔ ہر جگہ محکوم قوم کی

ذلت و رسوائی اُس کا چھپا کرتی ہے۔ لندن سے تعلق خاطر تو پہلے بھی کبھی نہ تھا۔ الحمد للہ! لیکن جتنے دنوں وہاں رہا۔ اس درودیوار سے میری بیگانگت برہتی ہی رہی۔ لندن کے درودیوار کا حال لکھنا فضول ہے۔ کسی ہندوستانی بھائی کو یورپ کے دیکھنے کا شوق ہو۔ روپیہ ضرورت سے زیادہ جیب میں ہر گناہ زندگی سے فرصت ملے۔ تو وہ ضرور ایک سفر کریں۔ مگر یہ یاد رکھیں۔ کہ برطانوی زندگی ایک آئینہ ہے جس میں کالا رنگ کچھ اور زیادہ کالا ہی نظر آتا ہے! اُونپا کے آثار قدیمہ دیکھنے ہوں۔ تو رومۃ الکبریٰ کے عبرت انگیز کھنڈر دیکھئے۔ جس کے ایک ایک چپہ پر ہزاروں برس کی تاسیخ کے نقوش ثبت ہیں۔ مناظر قدرت دیکھنے ہوں۔ تو سویزر لینڈ کی روح پرور وادیوں میں کچھ وقت گزارئیے۔ صنعتی اور تجارتی زندگی کے مسائل کا مطالعہ کرنا ہو تو جرمنی کا عزم کیجئے۔ اور اگر فطرت انسانی کی ادنیٰ اور اعلیٰ شہریت دیکھنا ہو۔ تو فرانس جائیے۔ انگلستان ان میں سے ہر چیز سے محروم ہے۔ الٹا بروسیاست۔ جہاں گہری وہمانہانی۔ جس کو فطرت انسانی کا ایک غیر جانبدار کچھ اُور کتا ہے۔ القصہ میں نے یہ ایک تیل کی حیثیت سے لندن کو دیکھا نہ کبھی یہ خیال آیا۔ کہ اس سرزمین پر ضرورت سے زیادہ ایک دن بھی قیام کیا جائے۔ ایک دن خدا جانے کیا دل میں آئی۔ کہ مسٹر عبدالرحمن صدیقی کے ساتھ ویشمنسٹر ایبی کو دیکھنے چلا گیا۔ تاریخی حیثیت سے ایک سیاح کے لئے یہ مقام یقیناً دلچسپ ہے۔ اس لئے کہ ایبی کی شاندار عمارت میں کہیں کہیں ابھی تک اُس کلیسا کے آثار قدیمہ بھی موجود ہیں۔ جس کو ہلغین سحیت نے سب سے پہلے سالہ عیسوی میں تعمیر کیا تھا۔ عمارت کے اس پُرانے حصہ میں جا کر راہبوں کی چھوٹی چھوٹی کوٹھریاں اور استقون کے بڑے بڑے کمرے جنکی دیواریں ابھی تک کھڑی ہوتی ہیں۔ انگلستان کے اُس تاریک عہد قدیم کو یاد

دلاتے ہیں۔ مسٹر عبدالرحمن چونکہ خود تاسیج کا عالمانہ ذوق رکھتے ہیں۔ اس لئے
 مجھ سے بھی متوقع تھے۔ کہ ہر ہر قدم پر مشاہیر کی قبروں اور یادگاروں کو بغور
 دیکھوں گا۔ عمارت کی خوبوں پر نظر ڈالوں گا۔ عدیوں کی پرانی اینٹوں کے
 پاس ٹھہر ٹھہر کر سیکسن قوم کی ابتدائی تاسیج کو دھراؤں گا۔ بیچارے بار بار مختلف
 چیزوں پر توجہ دلاتے تھے۔ دیکھو یہ چوسرا اور ٹینیسن کی قبریں ہیں۔ دیکھو۔ یہ
 ٹیکسپیئر۔ جانسن۔ بٹلر۔ ملٹن۔ ڈرائیڈن۔ اڈلین۔ گولڈ اسمتھ۔ شریڈین۔ سودی اور
 تھیکری کے مجسمے ہیں۔ ادھر آؤ۔ یہ مکالے اور ڈکنس کی یادگاریں ہیں۔ یہ دیکھو یہ
 پٹ کا نشان ہے۔ یہ ایڈورڈ ویکنفسر اور ہنری شتم کی عبادت گاہ ہے۔ وغیرہ
 وغیرہ چلتے چلتے برطانوی جمہوریت کے پُرانے نشانات پر نظر پڑ گئی۔ پارلیمنٹ
 کے ابتدائی اجلاس۔ سو برس پہلے کہاں منعقد ہوتے تھے۔ اُس زمانہ میں ملک
 کی عدالت عالیہ کہاں اجلاس کرتی تھی۔ چارلس اول کو سزائے موت کا حکم
 کہاں سنایا گیا تھا۔ کرامول نے کس جگہ پارلیمنٹ کو درہم برہم کیا تھا۔ وائٹ ہالنگ
 کے مقدمہ کی سماعت کہاں ہوتی تھی۔ بیچارے صدیقی صاحب تقاضے کر کے
 دکھاتے تھے۔ کہ دیکھو اس کھڑکی کے شیشہ فلاں صدی میں لگائے گئے تھے۔ یہ
 خراب فلاں شخص نے بنائی تھی۔ یہ مجسمہ فلاں شخص نے نصب کیا تھا۔ مگر آخر کا
 میری بے توجہی نے ان کے اصرار کو شکست فاش دی۔ وہ میری جہالت پر کشیدہ
 خاطر ہوئے۔ اور میں اُن مردہ مشاہیر اور آہی کے دیرینہ مکینوں کی صحبت سے اکتا
 کر بھاگا۔ آخر پھر میں نے کبھی کسی مشہور عمارت کے دیکھنے کا نام نہ لیا مجھے معلوم
 تھا۔ کہ لندن کا رقبہ معہ ملحقات ۷۰۰ مربع میل ہے۔ اور اس کی آبادی ۷۲ لاکھ
 کے قریب ہے۔ مگر وہاں کی ایک بالشت زمین بھی میرے حصہ میں نہ تھی۔ پھر
 میں کیا دیکھتا۔ کئی دفعہ خیال آیا۔ کہ ایک دن پارلیمنٹ کا اجلاس دیکھ لیں جہاں

ہندوستان کی قسمت کے فیصلے صادر ہوتے ہیں۔ یہ کچھ مشکل بھی نہ تھا۔ مگر میں نے سوچا کہ میں وہاں جا کر کیا دیکھوں گا۔ اور کیا سنوں گا۔ ہندوستان کے سولین اور فوجی حکام کے دو سو چار سو بھائی نظر آئیں گے۔ جو معاملات ہندوستان کے متعلق صرف رائے دیتے وقت ہاں یا نہیں کہہ دیا کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں جانتے۔ کہ ان کے چند ہزار اعضاء اور احباب ۳۲ کروڑ انسانوں کے گلہ باب ہیں! غرض وہ بھی نہ دیکھا۔ البتہ وزارت ہند کے دفتر میں اور نمبر ۱ ڈاؤنگ سٹریٹ یعنی وزیر اعظم کے دولت کدہ پر دو تین دفعہ بصورت اور بادل ناخواستہ حاضر ہونا پڑا۔ لندن کی سیاسی تمام ہاں ان کالی آنکھوں نے اتنا قصور ضرور کیا۔ کہ غروب آفتاب کے بعد کبھی کبھی ہائیڈ پارک۔ پکنڈلی اور اکسفورڈ اسٹریٹ کے ہنگاموں کو بھی ایک نظر دیکھا۔ جہاں یورپین زندگی کا ایک دوسرا رخ بھجبا نظر آ جاتا ہے۔ سو وہ کوئی انگلستان کی خصوصیت نہیں ہے۔ یورپ کے اکثر ممالک اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں! ایں خانہ تمام آفتاب است!

ان کے تعیش اور اخلاقی آزادی کا معیار ایشیائے بالکل مختلف ہے اس لئے ایک کالے آدمی کو یورپین فطرت کی ان رموز و خواص پر غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ اپنی زندگی کے برے بھلے دستور العمل کو بخشیں نہ لگے تو سمجھئے کہ بسا غنیمت ہے!

آغاز کار

لندن پہنچنے کے بعد ابھی وزیر ہند یا وزیر اعظم سے ملاقات کی نوبت بھی نہ آئی تھی۔ کہ لندن کے اخبار والوں نے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ صبح سے شام تک اخبارات کے درجنوں نمائندے آتے تھے۔ اور بد نصیبی سے چونکہ میں وفد کا سرکاری تھا۔ اس

لئے زیادہ تر مجھی کو مورچے پر ہنپڑتا تھا۔ ان سے باتیں بھی کروں۔ بحث بھی کروں
 ٹالنے کی ضرورت ہو تو ٹالوں۔ ہر شخص کی حیثیت کا صحیح اندازہ کروں۔ پھر اُسی
 اندازہ کے مطابق اُس سے باتیں بناؤں۔ واقعہ یہ ہے۔ کہ انگلستان کے اخبار
 نویسوں کی ایمانداری یا بدینتی کے متعلق کچھ بھی کہا جائے۔ مگر اس میں شک نہیں
 کہ وہ اپنا کام خوب کرتے ہیں۔ ممکن نہیں۔ کہ کوئی کم و بیش ممتاز شخصیت لندن
 میں آئے۔ اور چند گھنٹے کے اندر اخبار والے اس کا پتہ نہ چلا لیں۔ پھر وہ کتنا ہی
 بچنا چاہے۔ گھر پر۔ سڑک پر۔ ریل کے اسٹیشن پر۔ کہیں نہ کہیں اُس سے دو باتیں
 ضرور کر لیں گے۔ اور اگر کوئی شخص خود اخباری شہرت حاصل کرنا چاہے اور جیب
 میں روپیہ رکھتا ہو تو اس کے لئے ہر قسم کی آسانیاں موجود ہیں۔ شاید محدودے
 چند ایسے اخبارات ہوں۔ جو زبرد سر فواد نہی نرم شود کے کلیہ سے مستثنیٰ ہوں۔ ورنہ
 جتنے اخبارات ہیں۔ ان کو روپیہ دیکھے اور اپنی شخصیت کا اشتہار شائع کرا لیجئے۔
 تاہم یہ امر میری نظر میں کہ میں خود بھی اخبار نویسی کے ابجد سے روشناس ہوں
 یقیناً قابل تحسین ہے۔ کہ لندن کے اخبار نویس خبروں کی اشاعت کے متعلق
 اپنا فرض ایسی تندہی سے ادا کرتے ہیں۔ جس کا ہندوستان کے اخبار نویس
 کسی طرح صحیح اندازہ بھی نہیں کر سکتے۔ ان اصحاب کے حلوں سے میں تو بعض اوقات
 اس قدر پریشان ہو جاتا تھا۔ کہ ادھر ادھر منہ چھپانے کی کوشش کرتا تھا۔ سب سے
 زیادہ مشکل یہ تھی۔ کہ وہ ہمارے مقاصد کے متعلق سوالات کرتے تھے۔ اور
 یہاں اراکین وفد نے طے کر دیا تھا۔ کہ ابھی اخبارات میں ہماری طرف سے
 ایک حرفت شائع نہ ہو۔ پھر نہ صرف اخبار والے بلکہ تجارت پیشہ اصحاب بھی
 سیدھے چھوٹانی سے ملنے کے لئے آتے تھے۔ میں ہمیشہ سے ملنے جلنے اور عام طور
 پر ہر شخص سے بہت سی باتیں کرنے کا چور ہوں۔ بڑے بڑے مجھوں میں مجھ

سے بیٹھا نہیں جاتا۔ اپنے دوست احباب کی تعداد ہمیشہ نہایت محدود رہی۔ سبکی گفتگو سے جی الجھتا ہے۔ ظاہری اخلاق ایک فن ہے۔ جو مجھے نہیں آتا۔ حتیٰ کہ ناواقف اصحاب کو اکثر مجھ پر بددماغی کا گمان ہوتا ہے۔ لیکن اس دفعہ تو عمر بھر کی کسر بھل گئی۔ اپنے دوستوں سے کہتا ہوں۔ کہ اگر خاص قسم کی قابلیت نہ رکھتے ہوں۔ اگر میٹھی میٹھی مگر محض فضول اور بے معنی باتیں کرنی نہ آتی ہوں اگر (مروجہ علمی گزٹ کی اصطلاح میں) "جنینائٹ" کا کافی مادہ موجود نہ ہو تو کبھی بھول کر بھی کسی وفد کے سکرٹری نہ بنیں! اس زمانہ میں ایک ایسے عہدہ دار کے لئے چند خصوصیات لازمی ہیں۔ بیٹھا ہو۔ ضرورت کے وقت نرم اور گرم بن سکے۔ موقع ہو تو رعب بھی جما سکے۔ جھوٹ اگر اچھی طرح نہ بول سکتا ہو تو کم از کم یہ قابلیت تو ضرور ہو کہ کسی مباحثہ میں اپنا پلہ ہلکا نہ ہونے دے۔ اور جب یہ خطرہ پیش آئے۔ تو شاندار الفاظ۔ مرعوب کرنے والے لہجہ اور دیگر حرکات و سکنات سے اس کمی کو پورا کر دے۔ علاوہ بریں یہ بھی ضروری ہے۔ کہ کند یا کھنی مار کر ہمیشہ آگے کی صفوں میں گھس جایا کرے۔ اگر یہ نہیں تو پھر چاہے خدمت گار یا جہاز کا خلاصی بن کر یورپ چلا جائے۔ مگر کسی وفد کا سکرٹری بن کر ہرگز ہرگز نہ جائے۔ وہ دنیا ہی کچھ اور ہے۔ ہم جیوں کے بس کی نہیں! ایک اور مصیبت بھی تھی۔ میں خزانہ کا سانپ بن گیا تھا۔ یوں تو ہمارے لندن پہنچتے ہی دُور دُور کے رفقا و احباب جمع ہو گئے۔ مگر بیشتر یہ حالت تھی۔ کہ ہر ہمدرد دوست جو ملنے آتا تھا۔ اس کی نظر سیٹھ چھوٹانی کی جیب پر پڑتی تھی! لوگ سمجھتے تھے کہ وفد آیا ہے۔ لاکھوں لایا ہوگا۔ پھر خود سیٹھ صاحب کا وزن بھی بحساب ذرا سرخ کچھ کم نہ تھا! اچھے اچھے خوش پوش بظاہر نہایت خوشحال۔ باتوں کو سنئے تو نہایت مزیدار۔ مگر ساری گفتگو میں گرہ کا مصرعہ وہی ہوتا تھا۔ کہ ہو سکے تو وفد یا سیٹھ صاحب

کے بنک کی کتاب کا کوئی ورق ہاتھ آجائے۔
 ہمدردان و رفقا کی تعداد میں ہر روز کچھ نہ کچھ اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ اس انہج
 کے اظہارِ اُلفت سے بھی زیادہ ترجمہ بد نصیب کو واسطہ پڑتا تھا۔ اور جو کچھ گزرتی
 تھی اُس کے لئے ایک شنوی زہرِ عشق گھسنے کی ضرورت ہے!
 لندن کا ایک مہینہ مطالعہ فطرت انسانی کے لئے ایک اچھا اور وسیع مضمون
 ہے۔ جو انگریز اور ہندوستانی وہاں ہم کو ملے۔ ان میں انسانیت کے عجیب عجیب
 نمونے نظر آتے۔ ایک اخبار نویس محمد علی صاحب کے پرانے دوست اکثر تشریف
 لاتے تھے۔ عموماً ہمارے کھانے کے اوقات پر وہ ضرور تکلیف فرمایا کرتے تھے
 ان حضرات کی فوری اور اشد ضروریات کبھی کبھی سیٹھ چھوٹانی کی لمبی اور گہری
 اور بھاری جیب میں چھوٹا موٹا سوراخ بھی کر دیتی تھیں۔ لیکن یہ نہ بھی ہو تو ہر
 روز ایک وقت کا کھانا بھی کچھ کم مرغوب نہ تھا۔ یہ حضرت ایک بہت بڑے اجبا
 کے نمائندے تھے!

ایک دوسرے ”دوست“ تشریف اُردانی فرماتے تھے۔ ہر روز نیا لباس ہوتا
 تھا۔ اور وہ بھی اس قدر نفیس کہ اس غریب وفد کے ایک رکن کو بھی کبھی مسر
 نہ ہوا ہوگا۔ لباس کی تراش قانون فیشن سے نہ ذرہ کم نہ ایک ذرہ زیادہ۔ ٹائی
 کارنگ موزے کی وضع۔ دستانوں کی قطع کالر کی اونچائی۔ پتلون کی شکن۔
 ہر چیز کانٹے میں نہی تلی۔ چھریا جسم اور بالوں کی آلائش سے سارا چہرہ کلینٹا
 پاک۔ اگر کہیں بگنکم پلیس کے پاس مل جاتے تو میں سمجھتا۔ کہ شاید یہی پرنس آف
 ویلز ہیں۔ مگر ہمارے یہاں کے کھانے کی گھنٹی اور سیٹھ چھوٹانی کے بنک کی
 کتاب انہیں بھی بہت پیاری معلوم ہوتی تھی۔ لباس۔ وضع اور قطع یہ سب
 تو اُسی ”فن“ کے متعلق ضروری ”دائن“ تھیں۔ غرض اس فہرست میں بہت سے

نام ہیں! ان وارداتوں سے قطع نظر۔ اصل داستان شروع کرتا ہوں +

لندن پہنچنے کے دو تین دن بعد تمام اراکین وفد نے وزیر ہند کو رسمی اطلاع دی۔ کہ ہم حاضر ہیں۔ اس کے بعد یہ انتظار تھا۔ کہ وزارت عظمیٰ کے در دولت پر کب طلب کئے جائیں +

۱۱ مارچ کو پہلی ڈیور سی پر یعنی وزیر ہند کی خدمت میں طلب کئے گئے۔ اس تہیہ ملاقات کے بعد دوسرے دن ۱۲ مارچ کو وزیر اعظم سے ملاقات قرار پائی + اُس دن ۱۰ بجے ہم لوگ ہوٹل رٹرن میں پہنچے۔ جہاں ہز ہائینس سر آغا خان مقیم تھے۔ ان کو سنے کر پہلے وزارت ہند کے دفتر میں گئے تاکہ مسٹر مائٹیکو کو بھی ساتھ لے لیں۔ گو کہ سالار وفد سیٹھ چھوٹانی صاحب اور ترجمان وفد سید حسن امام صاحب تھے۔ مگر سچ پوچھتے تو جمعیت کے سپہ سالار اور اس برات کے دو لہا ہز ہائینس ہی نظر آتے تھے۔ شاید اس وجہ سے کہ صاحب موصوف دفاتر حکومت کے سمندروں کے بہت بڑے پیراک ہیں اور اونچی سے اونچی ایڑیوں تک پہنچ سکتے ہیں +

مسٹر مائٹیکو

بہر حال اُس دن صبح کو پہلی مرتبہ میں نے مسٹر مائٹیکو کو اچھی طرح دیکھا۔ اور اس کے بعد بھی کئی بار دیکھنے اور ان کی گفتگو کو سننے کے بعد میرے قلب نے طے کر لیا۔ کہ وزیر ہند کی شخصیت بہت دلنواز اور عثرہ طراز ہے۔ دوران سفر میں سید حسن امام صاحب اور ہز ہائینس آغا خان نے وزیر ہند کی تعریفوں کے اتنے دریا بہائے تھے۔ کہ مجھ جیسا بد عقیدہ بھی اپنی جگہ سے ہلنے لگا تھا لیکن

ان کو دیکھنے اور ان کو باتیں سننے کے بعد میری رائے میں اگر کوئی تغیر ہوا تو صرف یہ کہ مسٹر مائیکو اپنے فن تدبیر میں کچھ زیادہ سبکدست اور دلفریب ہیں! باقی اس کا تو میں نہ کبھی قایل تھا نہ ہوں۔ کہ کسی وزیر ہند یا وزیر اعظم کی عنایت سے ہندوستان اپنی کھوئی ہوئی عزت حاصل کر سکتا ہے۔ عزت تو صرف اُسی قوم کو حاصل ہو سکتی ہے۔ جو بے منت غیرے اُس کو حاصل کرنے کی اہلیت رکھتی ہو۔ شرط اول یہی ہے۔ اس لئے ان فروعات پر نظر کرنا یا یہ سوچنا۔ کہ ہم پر فلاں وزیر مہربان ہے۔ اور فلاں نہیں ہے۔ بالکل بیسود ہے۔ مسٹر مائیکو کی ادائیں تو سب ہی دلفریب تھیں۔ مگر ایک خاص ادا تو بہت ہی دلفریب تھی۔ (ایسی دلفریب تھی۔ کہ اگر ہمارے اعتدال پسند بھائی وہاں ہوتے تو نہ جانے کتنی دفعہ شدت عقیدت کے ساتھ غش پر غش آتے!) یعنی جب وہ ہندوستان کی جدوجہد کا ذکر کرتے تھے۔ تو ہمیشہ اپنی ذات کو ہمارے ساتھ اس طرح ملا لیتے تھے۔ کہ جو تجویز یا خیال بھی ان کی زبان پر آتا اسکو جمع کے صیغہ میں ادا کرتے۔ یوں کہ ”اب ہم کو یہ کرنا چاہئے۔“ ”وزیر اعظم سے ہم کو یہ کہنا چاہئے۔“ ”ہم اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گے۔“ وغیرہ وغیرہ جتنے ”ہم“ استعمال ہوتے۔ ان سب میں وزیر ہند اپنی شخصیت کو اراکین وفد کے ساتھ برابر کا شریک قرار دیتے تھے! یہ نصیب اللہ اکبر! لوٹنے کی جاتے ہے! ”اچہرہ پر مسکراہٹ ہے۔“ جو دوسروں کے دل تک پہنچتی ہے۔ زبان میں لوچ ہے جو مخاطب کو یقیناً متا کرتا ہے۔ طرز گفتگو کچھ ایسا وسیع اور عام ہے۔ یکہیئت مجموعی (اگر ان کی گفتگو کے اجزا الگ الگ نہ کئے جائیں) بہت ہی اُمید افزا نظر آئے۔ لیکن اگر کہیں اس گفتگو کا تجزیہ کیجے تو پھر حاصل عقاب ہے! صاحب وزیر ہند۔ ہندوستان اول کے ساتھ اپنی اہم رویوں کا اظہار اس قدر بے تکان اور فی البدیہہ کرتے ہیں۔ کہ

تفصیلی گفتگو کی گنجائش بہت ہی کم باقی رہ جاتی ہے۔ وزیر اعظم سے ہماری دوسری ملاقات میں صاحب موصوف شریک نہ تھے۔ غالباً دارالعوام کا اجلاس ہو رہا تھا۔ اور اس میں ان کی شرکت ناگزیر تھی۔ لیکن جب ہم ملاقات کے بعد وزیر اعظم کے کمرہ سے نکل رہے تھے۔ تو مسٹر مانٹیگو بھی صرف نتیجہ دریافت کرنے کے لئے آ پہنچے۔ اور جب یہ سنا۔ کہ ہم مایوس جا رہے ہیں۔ تو باوجود عظیم الشان کے چند منٹ ٹھہر گئے۔ اور ہم سب کو اطمینان بخشا۔ کہ خواہ ہماری جدوجہد طویل ہو۔ مگر ہم ضرور کامیاب ہوں گے۔ ”حسب معمول ہم اور ہمارے کی وسعت دہی تھی۔ کہ خود آجناب کی ذات بھی ہمارے ساتھ بدرجہ مساوی شریک بھی جانے! بعض اراکین وفد سے رخصتی ملاقات میں تو یہاں تک ارشاد ہو گیا۔ کہ ہندوستان میں جدوجہد جاری رہنی چاہیے۔ کبھی نہ کبھی ضرور کامیابی ہوگی! یہ ستم ظریفی کس قدر و لفریب ہے۔ اُدھر ارشاد ہوتا ہے۔ کہ ہاں بڑے چلو۔ اور اُدھر حکومت ہند کی باگ ڈھیلی کی جا رہی ہے۔ کہ اہل ملک کی جدوجہد کے تمام دروازے بند ہو جائیں۔ اس ساری سرگزشت کی معنی بین السطور کیا ہیں!

اس طرز تحریر سے یہ سمجھنا ضرور نہیں۔ کہ میں کسی حالت میں مسٹر مانٹیگو کی ہمدردیوں پر ذرا بھروسہ بھی نہیں کرتا۔ مگر جو اصحاب ان ہمدردیوں کو قومی جدوجہد کے پلے میں ایک بڑا وزن سمجھتے ہیں۔ وہ میرے خیال میں یا تو محض سادہ لوح ہیں یا قصداً واقعات و حقائق سے انکار کر رہے ہیں۔ اپنے پلے میں اپنے ہی وزن کی ضرورت ہے۔ مانگے ہوئے وزن کا وجود کچھ نہیں۔ علاوہ بریں ہم نے اب تک

۱۵۰ وزن کا حال تو یہ ہے۔ کہ وزیر اعظم نے بیک اشارہ ابد اپنی مصلحتوں کی قربان گاہ پر مسٹر مانٹیگو کو ایک بکرے کی طرح چڑھا دیا۔ اور ہم تو اپنی آنکھوں سے دیکھ آئے۔ کہ مسٹر لائیڈ جارج کے سامنے وزیر ہند ایک دفتر کے ہیڈ کلرک سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتے تھے +

جناب وزیر ہند کی تمام ہمدردیوں کا صرف ایک نتیجہ دیکھا ہے۔ یعنی نام نہاد تجویز اصلاحات۔ وہ نتیجہ آج عملی حیثیت سے ہمارے سامنے موجود ہے۔ اسکی اصلی قیمت سطح پر صاف نظر آرہی ہے۔ کچھ کلام ہو تو جدید کونسلوں کی روئیدادوں کو ایک دفعہ بغور پڑھ جائیے۔ غیر سرکاری ممبران کے اُن ریزولوشنوں کو دیکھیے جن کے پیش کرنے کی اجازت نہیں ملی یا جو کونسلوں میں باوجود مفروضہ غیر سرکاری اکثریت کی کثرت رائے سے نامنظور ہوئے۔ اُن سوالات پر نظر کیجئے۔ جو پیش ہوئے اور مسترد کر دئے گئے۔ یا ایسا جواب پایا۔ جس کے کوئی معنی نہیں ہوتے ہمیں اب تک مسٹر مانیگو کی ہمدردیوں سے جو کچھ حاصل ہوا ہے۔ اس کی میزان کل یہ کونسلیں ہیں۔ اور ان کونسلوں کی ساری حقیقت بس اتنی ہے کہ میں زبان کی دلفریب گلکاریاں۔ ان سے مسٹر سید حسن امام یا ہر مائٹس آغا خاں اور بعض دوسرے احباب کتنے ہی متاثر کیوں ہوں۔ مگر وہ بھی یہ نہیں بتا سکتے ہیں کہ اس اخلاق کریمانہ سے ہم کو اپنے مقاصد میں کہاں۔ کب۔ اور کتنی اعانت حاصل ہوئی میں نے مسٹر مانیگو کی شیریں زبانی سے نہ کبھی دھوکہ کھایا نہ آج ان کی سرد مہری کا شکوہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ یہ نہیں کہتا۔ کہ مسٹر مانیگو کی شیریں بیانی صرف دھوکہ دینے کے لئے اس قدر شیریں تھی۔ یا یہ کہ نیت دھوکہ دینے کی ہوتی تھی۔ مگر یہ اخلاق اس مفلس کا اخلاق ہے۔ جس کی جیب میں پیسے نہیں مگر سایل سے ہنس ہنس کر باتیں کرتا ہے۔ انکار کی جرأت نہیں اور اقرار کی اہلیت مفقود۔

البتہ از روئے انصاف اراکین وفد کو ذاتی طور پر مسٹر مانیگو کے شریفانہ اخلاق کا مشکور ہونا چاہیے۔ کہ انہوں نے ہمارے ساتھ ظاہری اخلاق میں کوئی کمی نہیں کی۔ اس زمانہ میں جب کہ خود اپنے وطن میں سید حسن امام جیسے مقتدر

اصحاب سے ایک معمولی انڈر سکرٹری گستاخی کر سکتا ہے۔ اور اچھے اچھے شرفا صاحب ضلع کی کوٹھی پر دھوپ میں سوکھا کرتے ہیں۔ وزیر ہند کا یہ اخلاق شرفا یقیناً قابل شکر یہ ہے۔ لیکن ان کی شان میں قصاید تصنیف کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آتی +

وزارت ہند کے دفتر میں وزیر ہند کی کونسل کا کمرہ نہایت سادہ ہے۔ اسی کمرہ میں ہم بیٹھے رہے۔ تا آنکہ ہنزہائیس آفاخان مسٹر مانٹیگو کو کسی دوسرے کمرہ سے لے کر آئے۔ اور ہم سب کا تعارف کرایا۔ اب گویا وزیر ہند کی سرکردگی میں ہماری جماعت نمبر ۱۷ اوڈننگ اسٹریٹ کی طرف چلی۔ چونکہ وزیر اعظم کا مکان دفتر ہند سے ملا ہوا ہے۔ اس لئے عمارتوں کے اندر ہی اندر ہم وہاں تک پہنچ گئے۔ وقت مقررہ پر اراکین وفد کو وزیر اعظم نے طلب فرمایا۔ سب سے پہلے وزیر ہند نے ہر شخص کو وزیر اعظم کی خدمت میں پیش کیا۔ اس کے بعد ہم سب ایک بیضاوی میز کے گرد بیٹھ گئے۔ اس طرح کہ ایک طرف وزیر اعظم مسٹر مانٹیگو اور مسٹر پوزر لائیٹھے۔ اور دوسری طرف تمام اراکین وفد۔ اور ان کے کاغذوں کے لدے ہوئے بستے اور گتے ہیں!

مسٹر لائیڈ جارج

عمر ستر برس سے کیا کم ہوگی۔ مگر چہرے کی سرخی اور جسم کی ساخت ہندوستان کے بہت سے نوجوانوں کو شرمادے گی۔ جنہوں نے سرکاری یونیورسٹیوں پر جوان ہونے سے پہلے ہی اپنی جوانی نثار کر دی ہے۔ بشرہ سے طبیعت کے سارے جوہر صاف ظاہر ہوتے ہیں۔ آنکھیں چھوٹی ہیں۔ مگر غیر معمولی چمک

رکھتی ہیں۔ اوپر کے ہونٹ پر بالوں کی ایک گھنی کپاری ہے۔ قد میانہ بلکہ اس سے بھی کچھ پست ہے۔ سر کے بال کم ہیں۔ مگر جو نہیں وہ گردن کی طرف ہندوستان کے قدیم وضع کی مثل لٹکے ہوئے ہیں۔ فی الجملہ یہ سراپا شاعر کے لئے دلفریب نہ ہو۔ برطانیہ کی محکوم اقوام کے لئے دلکش نہ ہو مگر علم النفس کے رموز و غوامض پر غور و فکر کرنے والے لوگوں کے لئے یقیناً ایک اچھا مضمون ہے۔

ہم لوگوں کے بیٹھتے ہی یہ بلا جملہ جو مسٹر لائڈ جانج کی زبان سے ادا ہوا۔ میری نظر میں انکی شخصیت کا ایک اچھا کس ہے۔ اپنی چمکتی ہوئی آنکھوں سے جلد جلد ہم سب کے حلیہ کو جانچتے اور پڑتے ہوئے کھنی مونچھوں کے سائے میں کچھ کچھ مسکراتے ہوئے فرمایا۔ کہ حضرات آپ کو معلوم ہے کہ آپ کہاں بیٹھے ہیں۔ یہ وہ کمرہ ہے جس میں سلطنت برطانیہ کی مجلس وزراء کے اجلاس منعقد ہوتے ہیں! ایک اداسے تفاخر۔ ایک کیف پندار۔ مرعوب و متاثر کرنے کی ایک بے ہنگام کوشش۔ اس ایک فقرے نے میرے سامنے برطانوی وزیر اعظم کی شخصیت کو مصوری پیش کر دیا۔ گویا فرماتے ہیں۔ کہ ہندوستانی غلام کے لئے اس سے زیادہ کون سا واقعہ مایہ فخر و مباہات ہو سکتا ہے۔ کہ وہ اپنے وجود حقیر کو سلطنت برطانیہ کی وزارت عظمیٰ کے ایوان اجلاس میں بیٹھا ہوا پائے۔ اے غلامو! دیکھو۔ آج تمہیں کیسی عزت نصیب ہوئی! ایک غلام کے غلامانہ دماغ کے لئے یہ تخیل گویا جنت النعیم کا تخیل ہے! بساط تدبیر کے اس شاطر کی پہلی چال جس نے یورپ کے بہترین سیاسی دماغوں کو شکست دی ہے۔ حتیٰ کہ جمہوریہ امریکہ کے صدر کو بھی مع اپنے تمام بلند آہنگ اخلاقی اصولوں کے میدان سے فرار پر مجبور کر دیا۔ کس قدر بھونڈی اور بے ہنگام تھی۔ دوسری اس سے بھی زیادہ۔ یعنی ابھی صرف تمہیدی گفتگو شروع ہوئی تھی۔ اور سید

حسن امام صاحب نے اراکین وفد کی جانب سے رسمی شکریہ کے محض چند الفاظ ہی ادا کئے تھے۔ کہ برطانوی وزیر اعظم نے سید صاحب ممدوح کی تعریف و توصیف کے دریا بہا دیئے۔ شاید ابھی بیچارے سید صاحب نے پانچ منٹ بھی تقریر نہ کی ہوگی۔ کہ مسٹر لائیڈ جارج کی شیریں بیانی اُن پر ٹوٹ پڑی۔ سرکاری رویہ میں وہ الفاظ کم و بیش کر دیئے گئے ہوں۔ مگر میرے دماغ میں وزیر اعظم کی اس ادا کے نقوش بجنہ موجود ہیں۔ فرمانے لگے۔ کہ مسٹر حسن امام آپ نہایت قابلیت سے گفتگو کر رہے ہیں۔ کاش کہ ترک بھی اپنے معاملہ کو اسی قابلیت سے پیش کر سکتے افسوس کہ ان کو آپ جیسا وکیل میسر نہیں۔ میں آپ کو آپ کی قابلیت پر مبارکباد دیتا ہوں۔ وغیرہ وغیرہ ۰

مبارک باد اس تقریر پر جو ابھی زبان پر نہیں آتی۔ مبارک باد اس قابلیت پر جس کا اظہار ہنوز نہ ہوا تھا۔ مبارک باد اُس وکیل کو جس نے اپنی بحث شروع بھی نہ کی تھی! وزیر اعظم کی کمان سے تیر چلا۔ مگر وقت سے پہلے۔ اگر مقصد یہ تھا۔ کہ مسٹر حسن امام کے دماغ میں تھوڑا سا نشہ پیدا کیا جائے تو اس جام پر کیٹ کے پیش کرنے میں ذرا جلدی ہوتی۔ میں ایک طرف بیٹھا ہوا ان تعریفوں کو سن رہا تھا۔ اور حیران تھا۔ کہ تعریف تو کی جا رہی ہے۔ مگر کس چیز کی۔ مسٹر حسن امام کی صورت کے علاوہ ابھی وزیر اعظم نے دیکھا کیا!

دوران گفتگو میں خصوصاً دوسری ملاقات کے دوران میں متعدد مسائل آئے تھے۔ جو ہماری طرف سے پیش ہوئے اور وزیر اعظم نے فرمایا۔ کہ ترکوں نے اس بات کا کبھی ذکر نہیں کیا۔ اسی طرح ہماری بحث کے بعض خاص خاص اجزا پر صاحب موصوف نے صرف اتنا فرمادیا۔ کہ میں نے اس بات کو سمجھ لیا۔ I have noted it. یا میں سمجھا۔ I see مگر ایک خاص انداز تھا۔

جس سے ہم ہر دفعہ شکست کھاتے تھے۔ یعنی یہ کہ جب کسی مسئلہ کے متعلق ہم نے اپنی بحث پر زور دیا۔ یا ان کے کسی بیان کی تردید کی معاوہ اُس بحث کو چھوڑ کر بلا تکلف کسی دوسرے جزو پر تقریر فرمانے لگے۔ اور پھر آخر تک ان کو یاد نہ آیا۔ کہ کس چیز کا جواب انہوں نے نہیں دیا۔ عہد نامہ سیور کے متعلق پہلی ملاقات میں جب حسن امام صاحب نے مختلف دفعات کا حوالہ دینا شروع کیا۔ تو وزیر اعظم کی گفتگو سے صاف معلوم ہوتا تھا۔ کہ ان دفعات کے الفاظ ان کے ذہن میں نہیں ہیں۔ آخر عہد نامہ کا ایک نسخہ منگو کر ہر دفعہ کو دیکھتے جاتے تھے۔ ہم نے سنا تھا۔ کہ مسٹر لائڈ جارج ضروری سے ضروری اور اہم سے اہم کاغذات کو بھی اکثر نہیں دیکھتے۔ اور ان کے سکرٹری اور دوسرے وزراء اس قسم کے کاغذات کو بعض اوقات دوسرے کاغذوں کے انبار میں دبا ہوا پاتے ہیں۔ معتبر اشخاص سے ہم نے سنا۔ کہ وزیر اعظم کی طاقت کا بڑا راز یہ ہے۔ کہ عین وقت پر زبردست تقریر فرما سکتے ہیں۔ اور بحث و مباحث میں ہر بات وقت پر سوجھتی ہے۔ بس۔ اسکے سوا جو کچھ ہے۔ وہ ان کی قسمت ہے! حال یہ کہ مسٹر لائڈ جارج سے نہ ان کی پارٹی کے سربراہ۔ وہ اصحاب رضامند ہیں۔ نہ جمہوریت خوش ہے۔ نہ پارلیمنٹ کی اکثریت ان کو کچھ زیادہ پسند کرتی ہے۔ نہ خاندان شاہی میں وہ اچھی نظر سے دیکھے جاتے ہیں۔ تاہم اقتدار قائم ہے۔ اور یورپ و ایشیا کی باگیں ہاتھ میں ہیں! تنک مزاج ہیں۔ اور بے پروا۔ مگر دنیا کا سراٹری کے نیچے دبائے ہوئے ہیں۔ دوسری ملاقات میں مسٹر حسن امام صلحنامہ سیور کے متعلق وفد کے خیالات پیش کر رہے تھے۔ اور ابھی آبنائے باسفوس کے مسئلہ تک پہنچ کر اس بات میں کچھ کہنا ہی چاہتے تھے۔ کہ دفعتاً وزیر اعظم نے گفتگو کا رخ بدل دیا۔ یہ وہی ایک اداسے خاص ہے۔ لندن کے

موسم کی طرح کہ ابھی بارش ہو رہی ہے۔ اور ابھی دھوپ نکل آئی۔ ابھی دھوپ ہے اور ابھی دھواں دہار برسنے لگا۔ وزیر اعظم بھی گفتگو کا ایک شاہانہ انداز رکھتے ہیں۔ جہاں جی چاہا گفتگو ختم کر دی۔ اور جس مسئلہ پر جی چاہا گفتگو کرنے لگے۔ چنانچہ مسئلہ باسفورس پر گفتگو کرتے کرتے دفعتاً مسٹر حسن امام کی تقریر کے سلسلہ کو یوں ختم کر دیا۔ کہ

”اگر آپ پسند کریں تو جانے سے پہلے میں مختصراً ان معاملات کے متعلق جو رائے برطانوی حکومت نے قائم کی ہے۔ اُس کو بیان کر دوں گا۔“
 ”یہ گریز جس قدر فوری تھی۔ اُسی قدر ہمارے لئے مایوس کن بھی تھی۔ یعنی دوسرے الفاظ میں ہمارے معروضات کو سننے کی بجائے ہم سے کہہ دیا گیا۔ کہ اب وفد کی مزید گفتگو فضول ہے۔ برطانوی حکومت اپنی رائے قائم کر چکی۔ اُس کو سننا بیجا ہے۔ اور تشریف لے جائیے!“

یہ جواب اس سوال کا تھا۔ جو صاف طور پر کیا جانا چاہئے تھا۔ اور نہیں کیا گیا۔ کہ آخر ہندوستان سے یہ تمام نیاز مند کیوں طلب کئے گئے ہیں اگر برطانوی وزیر اعظم کو صرف اپنے آخری فیصلوں کا سنا نا منظور تھا۔ تو ان غریبوں کو اس طویل سفر کی تکلیف دینی کیا ضرور تھی۔ چند سطریں گورنر جنرل کے دفتر میں بھیج دی گئی ہوتیں۔ اور بذریعہ ڈاک وفد کے تمام اراکین تک پہنچ جاتیں۔ کیا ضرور تھا۔ کہ اس دعوت کریمانہ کا احسان ان غریبوں کے ضعیف کندھوں پر رکھا جاتا۔

چونکہ واقعات اب پُرانے ہو گئے ہیں۔ اس لئے میں نے وفد کے متعلق بہت سے تفصیلی واقعات ان صفحات سے نکال دیئے ہیں۔ وہ اس تاریخ کا ایک جز ہیں۔ اور لکھنے والا کبھی ان کو لکھے گا۔

ترکی وفد

جیسا کہ اخبارات سے عام طور پر معلوم ہوا ہوگا۔ لندن کانفرنس میں دو ترکی وفد آئے تھے۔ ایک قسطنطنیہ کی حکومت کی طرف سے اور دوسرا انگلورا سے جو غازی مصطفیٰ کمال کی حکومت کا نمائندہ تھا۔ دونوں وفد کے ممتاز اراکین حسب ذیل تھے:-

وفد انگلورا

- ۱- ہزیکسلیسی بکرسائی ہے۔ سردار وفد
- ۲- " جامی ہے۔ رکن وفد
- ۳- " یونس نادوی ہے " "
- ۴- " حسین ہے " "
- ۵- " ڈاکٹر تہادر شاد " "
- ۶- " منیر ہے " "
- ۷- " روف احمد ہے " "
- ۸- " اشرف روشن ہے " "
- ۹- " جاوید ہے " "

وفد قسطنطنیہ

- ۱- ہزیکسلیسی رشید پاشا۔ سردار وفد
- ۲- " عثمان نظامی پاشا۔ رکن وفد
- ۳- " داماد اسماعیل ہے۔ " "
- ۴- " شقی ہے " "
- ۵- " زغیب ریف ہے " "
- ۶- " کپتان رضا ہے " "
- ۷- " ممدی ہے " "
- ۸- " لفٹنٹ کرنل قادری ہے " "
- ۹- " قدری ہے سکرٹری

وزیر اعظم سے پہلی ملاقات کے بعد ہی ترک احباب سے ملاقاتیں شروع ہوئیں۔ مختلف اوقات میں ہم میں سے مختلف اصحاب (سوائے سید حسن امام صاحب اور ہزیکسلیسی آغا خان کے جو غالباً سوائے چند پہلے کے کبھی ترکوں کے نمائندوں سے نہ مل سکے) دونوں وفد کے اراکین سے ملتے رہے۔ اور ہمارے

لئے یہ امر دو گونہ خوشگوار تھا۔ کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں سے نہ صرف تبادلہ خیالات اور مشورہ کرنے کے خواہشمند تھے۔ بلکہ ان کی خالص اسلامی اخوت متقاضی ہوئی تھی۔ کہ جہاں کہیں ضرورت ہو۔ وہ ہمارے سامنے اپنی گزشتہ غلطیوں یا فرد گزشتوں کا بلا تکلف اعتراف کریں۔ اور آئندہ کے لئے فراخ دلی کیساتھ ہمارے مشوروں کو سنیں۔ یہ ہم نے سوئٹزر لینڈ اور اٹلی میں بھی ترک احباب سے صاف صاف سنا۔ اور لندن میں بھی محسوس کیا۔ کہ تقریباً تمام قوم پرست ترک کمیٹی اتحاد ترقی کے ممتاز اراکین کی اس ابتدائی غلطی کو دیکھ رہے ہیں۔ جو انہوں نے کی تھی۔ یعنی یہ کہ تحریک اتحاد تورانی کی تبلیغ و اشاعت میں اپنے منہمک ہو گئے تھے۔ کہ عالمگیر اتحاد اسلامی کے وسیع تر میدان کو بالکل نظر انداز کر دیا۔ اور یہ کہ انہوں نے اتحاد تورانی کے محدود دائرہ میں اپنی بہترین کوششوں کو صرف کیا۔ حالانکہ اس وقت بھی نہ صرف ہندوستان کے مسلمان بلکہ تمام عالم اسلام اتحاد اسلامی کی ضرورت کو محسوس کر رہا تھا۔ یہ سچ ہے۔ کہ ملک کے اندرونی حالات کو دیکھتے ہوئے تحریک اتحاد تورانی ایک ضروری تحریک تھی۔ اس لئے کہ ہندوستان کی طرح سلطنت عثمانیہ میں بھی مختلف المذہب لوگ آباد ہیں۔ اور ان سب کو ایک ہی قومیت کے دائرہ میں لانے کے لئے اس طرح کی کوئی نہ کوئی تحریک پیدا کرنی ضرور تھی۔ اور بلا شک اُسی تحریک کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ جب ترک احرار کی فوجیں استبدادیت کے دیرینہ قلعوں کو مسمار کرنے بڑھیں تو انکی صفوں میں ہر قوم شریک تھی۔ اور ارمنی و یہودی تک شانہ بشانہ جا رہے تھے۔ یہ سب سچ ہے۔ مگر ترک احرار کے پاس اس اعتراض کا جواب نہیں۔ کہ جب ان کی قومی حیثیت محض مقامی نہ تھی بلکہ از رو سے مذہب وہ تمام عالم اسلامی کی تیناؤں اور آرزوؤں کا آخری نقطہ نظر تھی۔ تو ان کو اندرونی حالات کے لحاظ سے۔ صرف ایک اسی

تحریک میں اس قدر منہمک نہ ہونا تھا۔ خصوصاً جبکہ ان کو یورپین دول کے حلوں سے بچنے کے لئے تمام عالم اسلامی کی ہمدردیاں درکار تھیں۔ واقعہ یہ ہے کہ اتحاد اسلامی خواہ وہ یورپین اجاب کی نظر میں کتنا ہی خطرناک کیوں نہ سمجھا جائے مسلمانوں کے لئے ایک جزو مذہب ہے۔ جس کو نظر انداز کرنا ممکن ہی نہیں۔ اسلامی قومیت کا سنگ بنیاد اخوت اسلامی ہے۔ اور اس عہد ابتلا میں تو تحفظ خود اختیاری کی وہی ایک دیوار ہے۔ جس کے سایہ میں ہر ملک کا مظلوم مسلمان دم لے سکتا ہے۔ جب اس حقیقت نفس الامری کو تسلیم کر لیا جائے (اور کون ہے جو گذشتہ پچاس سال کی تاریخ کو جھٹلا سکے) کہ اگر سارا یورپ نہیں تو اس کا بڑا حصہ مسلمانوں کے حاکمانہ اقتدار اور قومی آزادیوں کا دشمن ہے تو پھر معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اسلامی اقتدار کی گرتی ہوئی دیواریں کیونکر سنبھالی جائیں یہ بھی یاد رکھنا چاہئے۔ کہ یورپ کی موجودہ قومیت کا تخیل۔ اسلام کی قومیت کا تخیل نہیں ہے۔ اور نہ ہو سکتا ہے۔ یورپ نے مذہب سے بے پروا ہو کر اپنی قومیت کو جغرافیائی حدود کے اندر محدود کر دیا ہے۔ اُس کا سطح نظر مادیت ہے۔ نسل و مذہب تہذیب و تمدن سب اسی قومیت کے ماتحت ہیں جو حکومتوں اور سلطنتوں کے جغرافیائی حدود میں پرورش پاتی ہے۔ قیصر جرمنی انگلستان کے بادشاہ کا کتنا ہی قریب کا رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ مگر اس کی قومیت جرمن ہے۔ اور قومیت کے مصلح ہر حال میں خاندانی اور موروثی تعلقات پر حاوی ہیں۔ سارے یورپ کا نظام زندگی اسی تخیل پر مبنی ہے۔ لیکن اسلام کی تاریخ شاہد ہے۔ کہ گذشتہ تیرہ سو برس میں کبھی اس اصول قومیت پر اسلامی اقتدار کی عمارت تیار نہیں ہوئی یہ سچ ہے۔ کہ ایک ہی وقت میں مختلف سلطنتیں بھی تھیں۔ ان میں جنگ و جدل بھی ہوتا تھا۔ رقابتیں بھی ہوتی تھیں۔ مگر مذہبی اخوت کے حلقہ سے کوئی

باہر نہ جاسکتی تھی۔ یزید جیسا حکمران کہ اس کی مجرمانہ خود پرستی نے جگر گوشہ رسالت
 کے پاک خون سے اپنا دامن رنگ لیا۔ اسلامی در دست سے باہر نہ جاسکا انفرادی
 حیثیت سے وہ بیشک گردن زدنی تھا۔ مگر وہ کوئی جدا قومیت قائم نہ کر سکا۔ خود
 ہندوستان کے اسلامی عہد میں کھلی ہوئی تاریخی شہادتیں موجود ہیں۔ کہ باوجود
 اُس جاہ و جلال کے جو مغلوں کو اور مغلوں سے پہلے دوسرے حکمران خاندانوں
 کو حاصل تھا۔ مسئلہ خلافت کے سامنے ہندوستان کے بڑے سے بڑے اسلامی
 تاجدار کا سر بے اختیار جھکتا تھا۔ بادشاہ خلیفہ اسلام کے مرسلہ خلعت و مراسلت
 کا استقبال کرنے شہر پناہ سے باہر نکل آتا تھا۔ حالانکہ نہ وہ سلطان ترکی کا مات
 تھا نہ اس کا ملک عثمانی سلطنت سے قریب تھا۔ کہ حملہ کا اندیشہ ہو۔ اس راز کی
 کنجی یہی ہے۔ کہ اسلام نے افواج اسلامی کا وسیع دائرہ قائم کیا جس کے اندر
 ہر رنگ و نسل کے مسلمان۔ ہر ملک کے رہنے والے ہر سلطنت کے تاجدار
 اور والی و وارث شامل ہیں۔ اس دائرہ کی حدود کو خلافت اسلامی کے نظام
 سے مستحکم کیا گیا۔ بڑے دائرہ کے اندر بہت سے چھوٹے دائرے بنتے اور
 بگڑتے رہے۔ اسلامی حکومتیں قائم ہوتی رہیں۔ اور تباہ ہوتی رہیں۔ بادشاہوں
 نے اپنی ملک گیری سے سلطنتوں کے جغرافیائی حدود کو بدل ڈالا۔ کبھی غالب رہے
 اور کبھی مغلوب ہوئے۔ دنیا کا یہ کارخانہ اور یہ نشیب و فراز بدستور قائم ہے لیکن
 غالب و مغلوب فاتح و مفتوح بلند و پست کوئی اس دائرہ سے باہر نہ جاسکا۔
 اور جب چلا گیا۔ تو پھر اسلامی دنیا میں اس کے لئے کوئی جگہ باقی نہ رہی۔ خلافت
 اس نظام زندگی کا ایک غیر متزلزل ضابطہ ہے جو تمام مختلف عناصر میں ربط
 باہمی قائم رکھتا ہے۔ دور جدید میں جب یورپ نے کبھی دوست بن کر کبھی دشمن
 بن کر خلیفہ اسلام کی سلطنت کے اقتدار کو تباہ کرنا شروع کیا۔ تو اُسی وقت

تمام عالم اسلامی میں اتحاد اسلامی کے بڑے بڑے داعی پیدا ہوئے مثلاً خود قسطنطنیہ میں ابو الاحرار مدحت پاشا ان کے معاصرین مصطفیٰ کامل پاشا رشید پاشا ضیا پاشا۔ علی سحاری آفندی۔ جواد پاشا۔ عمر پاشا۔ اور پھر عہد حاضر کے ترکی احرار انور و طلعت و شیخ شادیش و مارشل شفقت پاشا وغیرہ سب ایک ہی منزل کی طرف جا رہے تھے۔ اور ایک ہی آواز بلند کر رہے تھے۔ ایران میں عہد انقلاب کے حریت پرست مجتہدین اور مرزا رضا کرمانی جیسے احرار کہ انہوں نے عہد ابتداء صغیر میں آزادی و حریت کے لئے اپنا جان و مال قربان کر دیا۔ اسی طرح مصر میں مفتی شیخ محمد عبدالہ۔ علی پاشا۔ مبارک محمود شاہ فلکی۔ مصطفیٰ کامل پاشا اور ان کے جانشین اعرابی پاشا اور ان کے شرکاک کار۔ ٹیونس میں شیخ محمد بیرم اور سید خیر الدین پاشا وسط ایشیا و ترکستان میں اسماعیل بے۔ اور سب سے بڑا داعی سریت سید جمال الدین افغانی۔ یہ سب شمنوکی سازشوں کو دیکھ رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ قافلہ غافل نہ ہو جائے۔ وہ جانتے تھے کہ اسلامی قومی مضحک ہو رہے ہیں۔ اور اس حالت میں اسلام کی عالمگیر قومیت کے مختلف اجزا اپنے اپنے مقام پر ناموس اسلامی کا تحفظ نہ کر سکیں گے۔ ان کے لئے اتحاد اسلامی کا متحدہ تخیل ہی ایک سپر ہے۔ جو دنیا میں اسلام کی عزت قائم رکھ سکتا ہے۔ اب اگر ہمارا نظام زندگی جو ہر حال میں مذہب کا تابع ہے۔ یورپ کی مادیت کا راستہ روکتا ہے۔ تو ہم معذور ہیں۔ الحمد للہ کہ وہ زمانہ گزر گیا جب ہندوستان میں بڑے بڑے بزرگان ملت۔ Pan Islamism (تحریک اتحاد اسلامی) کا نام پر لانے کی جرات نہ رکھتے تھے۔ اچھے اچھے قوم پرستوں کو دیکھا۔ کہ وہ اس نام کو اپنی زبان و قلم سے دور رکھتے تھے۔ مبادا ہندوستان کے حاکم یا دوسرے ہموطن ناخوش ہوں۔ وہ کہتے تھے کہ یہ چیز سچ اور صحیح ہے۔ مگر اس کے نام

کا نقارہ بجا کر خواہ مخواہ یورپ کو کیوں بھڑکاتے ہو ؟
ہم نے اس سفر میں محسوس کیا۔ کہ اتحاد اسلامی کی اصل نوعیت کو ترکوں
کی ایک جماعت اب لہجی طرح سمجھ رہی ہے۔ انسان کچھ کھو کر سیکھتا ہے عربوں
کی ہمدردیوں سے محروم ہو کر ترکوں کو اب معلوم ہوا۔ کہ وہ غلط راستہ پر جا رہے
تھے۔ اور سچے مسلمانوں کی طرح وہ اس غلطی کا اعتراف کرتے ہیں۔ انہوں
نے دیکھ لیا۔ کہ یورپ کی جغرافیائی قومیت جس کی تقلید انہوں نے کرنی چاہی تھی
مسلمانان عالم کے درد کی دو انہیں ہے۔ مجھے پہلے یہ خیال تھا۔ کہ شاید ابھی
تک ترکوں نے اپنی اس غلطی کو محسوس نہیں کیا۔ لہذا ان میں رومانیوں
سویزر لینڈ میں ہر جگہ جو ترک لے۔ ان کی نظر کو اب میں نے بہت وسیع پایا۔
نہ صرف نظر وسیع ہے۔ بلکہ قوی عمل بھی مضمحل نہیں۔ الحمد للہ! وہ ہر طرف
عناصر اسلامی کے اتحاد کی فکریں کر رہے ہیں۔ مدافانہ حیثیت سے نہ کہ جارحانہ
حیثیت سے۔ بلاشبہ اسلامی قومیت سارے عالم میں کمزور ہے۔ اور کمزور کو
صرف دفاع کی فکر چاہئے درحقیقت اتحاد اسلامی تحفظ خود اختیاری کے
فطری احساس کا عین اقتضا ہے۔ اس کا مقصد دوسروں پر حملہ کرنا نہ کبھی تھا
نہ ہے۔ اور یوں تو ہر چیز کا راسخ حقیقی کی مصلحتوں پر منحصر ہے! یورپ میں
جس چیز کو امپیرلزم (توسیع سلطنت و اختیارات شاہانہ) کہتے ہیں۔ اس کا مفہوم
مسلمانوں کے کمین اسلامزم سے کوئی نسبت ہی نہیں رکھتا۔

ہم لندن پہنچے تو ترکی د فود جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔ تاہم جو کچھ
وقت ملا۔ وہ باہمی تبادلہ خیالات میں صرف کیا گیا۔ نام نہاد حکومت قسطنطنیہ
کا د فود تو اپنی کمزوری کے علاوہ برطانوی اثرات کے تحت میں اپنی مجبوری و
مذہوری کو اس قدر محسوس کرتا تھا۔ کہ اگر ہم سے دل کھول کے باتیں کرنا بھی

چاہتا ہو تو ظاہر ہے۔ کہ یہ امر اُس کے امکان سے باہر تھا۔ وہ کوئی آزاد
دُفد تو تھا نہیں۔ کہ اپنی قوم کے صحیح جذبات کو پیش کر سکتا۔ تاہم اس میں شبہ
نہیں۔ کہ اس کے اراکین کے دلوں میں اس عہد بتلا کے کانٹے چبھ رہے
تھے۔ ہم اُن کے ایک ایک لفظ سے ان کی کیفیات قلبی کا اندازہ کر سکے۔
البتہ زبان نہ تھی۔ برخلاف ان کے انگور اکا دُفد زبان بھی رکھتا تھا۔ اور
بازو بھی بکر سامی بے کی شخصیت سے گو پہلے ہم آشنا نہ تھے۔ لیکن دو چار
ملاقاتوں کے بعد بلا تکلف یہ رائے قائم کر سکے۔ کہ ان کی شخصیت کافی وزن
رکھتی ہے۔ مسٹر لائڈ جارج نے تو بار بار ہم سے یہی فرمایا کہ بکر سامی بے اپنے
معاملہ کو اچھی طرح پیش نہ کر سکے۔ لیکن ہم نے جب بکر سامی بے سے باتیں
کیں۔ تو ہمارے لئے وزیر اعظم کی رائے سے متفق ہونا ناممکن نظر آیا۔ خود
برطانوی اخبارات کے کالموں میں یہ حقیقت پوشیدہ نہ رہ سکی۔ کہ دُفد انگور
کے سردار کے طرز عمل نے سپریم کونسل پر اپنا سکہ بٹھا دیا۔ اور مخالفین کو بھی
تحسین و آفرین پر مجبور کر دیا۔ انگلستان کے اخبارات نے ان کی ہوشمندی اور
معاملہ فہمی کا اعتراف کیا۔ یہ ایک فال نیک تھی۔ کہ بجائے اس کے کہ
دونوں دُفد میں کوئی اختلاف پیدا ہوتا۔ خود رشید پاشا نے اپنی معذوریوں
پر نظر کر کے مصلحت وقت کو محسوس کیا۔ اور اپنی ضعیف العمری کا عذر کر کے
گفت و شنید کے عام سلسلہ کو بکر سامی بے کے سپرد کر دیا۔ اور اس طرح دُفد
مصطفیٰ کمال کے نامندے کی قابلیت کا عملاً اعتراف کر لیا۔ بلکہ اپنی مصلحت
اندیشی کا بھی ایک اچھا ثبوت دیا۔ بکر سامی بے نے بھی جس خوش اسلوبی کے
ساتھ اپنی پہلی تقریر میں رشید پاشا کی مراتب عالی کا اعتراف کرتے ہوئے۔
ان کی ملت پرستی کی داد دی اور بلحاظ عمر و مرتبہ کے اپنے سے بزرگ تصدیق

کے ہوتے ہوئے دونوں وفود کی ترجیحی کا حق جس خوبی سے ادا کیا۔ وہ صاحب موصوف کی قابلیت کا ایک قابل قدر نمونہ ہے۔ پھر دوران کانفرنس میں جس سنجیدگی اور سنجشگی کے ساتھ انہوں نے کام کیا۔ اس کا ایک عکس اخبارات کے کالموں میں دیکھ لیجئے۔ روز اول سب سے پہلے انہوں نے اپنے مطالبات کی بنیاد مضبوط کی یعنی صاف طور پر کہہ دیا۔ کہ حکومت انگورا عہد نامہ پیپور کی بنا پر کوئی گفتگو نہیں کر سکتی۔ اس لئے کہ اُس نے نہ اُس عہد نامہ کی ترتیب میں بحیثیت ایک فریق کے کوئی حصہ لیا نہ اس کی نظر میں اتحادیوں کی یہ خود ساختہ دستاویز کوئی وجود رکھتی ہے بلکہ ابھی تک اسی اصول پر چبے ہوئے ہیں) *

بکر سامی۔ بے نے کانفرنس میں پہلا قدم یوں اٹھایا۔ اور اس طرح اپنے لئے گفت و شنید کی بہترین راہ نکالی۔ افسوس ہے۔ کہ ہم لوگوں کو ان سے باتیں کرنے کا کافی موقعہ نہیں ملا تاہم جو کچھ دیکھا۔ اور انکی زبان سے جو کچھ سنا۔ وہ ہمارے قلوب کی تسکین کے لئے بالکل کافی ہے۔ اور ہم پورے اطمینان قلب کے ساتھ کہہ سکتے ہیں۔ کہ حکومت انگورا صحیح راستے پر جا رہی ہے۔ اور الحمد للہ اس کے قدم استوار ہیں!

وفد انگورا کے دوسرے ممتاز رکن ڈاکٹر نہاد رشاد تھے۔ جو ایک نوجوان شخص ہیں۔ اور وہ سنجشگی نہیں رکھتے۔ جو گرم و سرد بھیلنے کے بعد ہی حاصل ہوتی ہے۔ اس میں کلام نہیں۔ کہ جماعت احرار میں انکی ذہانت اور قابلیت ایک خوشگوار چمک رکھتی ہے۔ ممکن ہے۔ کہ ان میں ایک خضیت جہلک خود بینی کی بھی نظر آئے۔ لیکن ان کی موجودہ خدمات کے سوا دوسری چیزوں پر نظر کرنے کی ضرورت نہیں۔ جامی ہے (جن کا ذکر سفر انلی کے سلسلہ میں آئے گا)

برکسامی بے کے ہم پلہ لوگوں میں ہیں۔ اور سب سے زیادہ ان کی متانت و
سنجیدگی سے متاثر ہوا۔

ہم کو جتو تھی۔ کہ غازی مصطفیٰ کمال اور ان کی حکومت کے صحیح حالات
سنیں۔ اور یہ اندازہ کر سکیں۔ کہ اگر یونانیوں کا دست دراز ہوا۔ اور ان کی تلوار
بے نیام ہوتی تو انا طولیہ کے مجاہدین اسلام کس حد تک ان کا مقابلہ کر سکیں
گے۔ اس وقت تک یونانیوں کا حملہ شروع نہ ہوا تھا۔ مگر مدبرین انگورا اچھی طرح
جانتے تھے۔ کہ ایسا ہونا ہے جس وقت یونانیوں نے (غالباً اپنے اجاب کی
راے کے مطابق) سمرنا کے متعلق بین الاقوامی کمیشن کے فیصلہ پر حصر کرنے
سے انکار کیا۔ اُسی وقت ترکوں نے سمجھ لیا تھا۔ کہ اب فیصلہ صرف تلوار ہی
سے ہو سکے گا۔ اور وہ اُس آنے والے وقت کے لئے تیار تھے۔ یہ سمجھ لینا چاہئے
کہ میں اس باب میں تفصیلات پر گفتگو کرنا مناسب نہیں سمجھتا۔ لیکن جنگ
کے جو حالات اس وقت تک ہندوستان میں معلوم ہو سکے ہیں۔ ان سے اندازہ
ہو سکتا ہے۔ کہ ترک غافل نہ تھے۔

واقعات ابھی تک اس تیزی کے ساتھ رونما ہو رہے ہیں۔ کہ میں قطعی
طور پر پیش گوئی کی جرات نہیں کر سکتا۔ ایک طرف صلح کی گفتگو میں ہو رہی
ہیں۔ اور ایک طرف جنگ کا سامان معلوم نہیں۔ کہ ان اوراق کے شائع
ہونے تک کیا صورتیں پیدا ہوں۔ مدبر حقیقی اپنے مصلح کو خود ہی جانتا ہے۔
آئندہ جو کچھ ہونے والا ہے۔ وہ اُسی کے علم میں ہے۔ غیروں اور دشمنوں کا
شکوہ اور دوستوں کی تعریف۔ یہ سب فضول ہے۔ جو کچھ واقعات گزر چکے
وہ ہر طرح اُمید افزا ہیں۔ جو آئندہ پیش آنے والے ہیں۔ ان کو خدا پر چھوڑیے
یہی کام کیا کم ہے۔ (اگر مسلمانان ہند کے دل میں کافی درد ہو) کہ اپنی معذرت

و مجبوری کے عالم میں ہم مجاہدین اسلام کی جو کچھ مدد ہو سکے کرتے رہیں۔ اس کے بعد دعا اور آمینا جابت! الحمد للہ کہ دعائیں مقبول ہوئیں اور کار ساز حقیقی نے ترکونکو سرفراز فرمایا)۔

ایک ضیافت

۱۲ مارچ کو وزیر اعظم سے پہلی ملاقات ہوئی اور ۱۴ مارچ کو ہمارے وفد کی طرف سے ترکی وفد کو سوائے ہوٹل میں ایک پرتکلف ضیافت دی گئی جس میں ان وفد کے تقریباً تمام اراکین اور ہست سے ہندوستانی احباب مقیم لندن شریک تھے۔ نہ اسکے۔ تو صرف سید امیر علی ورنہ تقریباً تمام سرکاری وغیرہ سرکاری احباب (حتی کہ صاحب زادہ آفتاب احمد خان صاحب بھی) موجود تھے۔ کھانے کی میز پر وسط میں سیٹھ چھوٹانی صاحب اور ان کے داہنی طرف بکر سامی بے اور بائیں جانب رشید پاشا تشریف رکھتے تھے۔ توفیق پاشا بوجہ علالت شریک نہ ہو سکے۔ سوائے ہوٹل کی خالص انگریزی آب و ہوا میں کم وبیش پچاس ہندوستانی اور ترکی اصحاب کا اجتماع ایک مخصوص کیفیت رکھتا تھا بعض غیر مسلم اصحاب بھی شریک تھے۔ ہندوستان کے مشہور خیر خواہ مسٹر بی۔ جی ہارنمن۔ اڈیٹر جمبے کرائیکل۔ گوپچارے علیل تھے۔ مگر تشریف لائے تھے۔ ان کے علاوہ غیر مسلم اصحاب میں مسٹر لوبان جی۔ مسٹر آنک۔ مسٹر وکیل۔ مسٹر مارشل۔ مسٹر دو۔ بے مسٹر سینٹ نہال سنگھ اور مسلمانوں میں مسٹر شعیب قریشی۔ مسٹر عبدالرحمن صدیقی۔ مسٹر سید حسین۔ مسٹر اصفہانی۔ ڈاکٹر عبد المجید۔ مسٹر عبد القیوم ملک۔ مسٹر دوست محمد علی۔ صاحب زادہ آفتاب احمد خان وغیرہ بھی کھانے کی میز پر موجود تھے اجتماع خوب تھا۔ اور دلچسپ ہوتا اگر رسمی تواضع اور تصنع میں وقت ضائع نہ کیا

جانا۔ اس قسم کی دعوتوں ضیافتوں اور محفلوں سے میری طبیعت ہمیشہ الجھا کرتی ہے۔ ساز و سامان بہت ہوتا ہے۔ کھانے بھی مزے دار ہوتے ہیں۔ (اور مجھے ضرور پسند آتے ہیں بشرطیکہ میٹھی چیزیں زیادہ ہوں۔ اور خوب میٹھی ہوں) اگر تقریریں ہوتی ہیں۔ تو وہ بھی بعض اوقات دلچسپ ہوتی ہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ لیکن اس سب میں پابندی رسم و رواج کا طبع اور تصنع کی کھوٹ بھی موجود ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ اس قسم کی صحبتیں اکثر بے نتیجہ ثابت ہوتی ہیں۔ مثلاً اس موقع پر ہم نے ترکی و فد کے ممبران کو خوب دیکھا۔ ان سے باتیں بھی کیں۔ مگر زیادہ تر محض رسمی۔ ایک فوٹو بھی بڑے اہتمام سے کھینچا گیا۔ دو تین گھنٹہ خاصی چہل پہل رہی۔ لیکن اس کے بعد کیا! اگر ایک دسترخوان پر بیٹھ کر کھانا جذبات اخوت و محبت کو ترقی دینا ہے۔ (اور میں مانتا ہوں۔ کہ ایسا ہوتا ہے) تو اس کے لئے بہترین صورت یہ ہے۔ کہ اس قسم کے چھوٹے چھوٹے بہت سے اجتماع ہوتے رہیں۔ ہر اجتماع میں دس پانچ آدمی ہوں۔ اور وہ بے تکلف بیٹھ کر کھائیں اور باتیں کریں۔ ورنہ یہ تو ایک رسم ہے۔ اور ایک ”شان“ ہے۔ کہ بڑی بڑی ضیافتوں کا اشتہار دیا جائے! مختصر یہ کہ میں تو ہمیشہ اس قسم کے ہنگاموں سے بھاگتا ہوں۔ اور اگر وفد کا سرکاری نہ ہوتا۔ تو اس موقع پر بھی بھاگ نکلتا۔ جیسا کہ بعض دوسری تقاریب میں جہاں مجھے موقع ملا۔ میں نے کیا۔ ہلکی ہوا میں دماغ و دل رضا مند ہوتے ہیں۔ تیز جھونکے چلنے لگیں تو حواس پریشان ہو جاتے ہیں۔ یہ اپنی اپنی طبیعت کی افتاد ہے۔ بہر حال سیٹھ چھوٹانی صاحب نے ایک رسمی تقریر فرمائی۔ اور اس میں ترکہ اجاب کو بتایا۔ کہ مسئلہ خلافت اب ہندوستان کے ہندو مسلمانوں کا مشترکہ مسئلہ بن گیا ہے۔ اور اس مطالبہ حق و انصاف میں ہندوستان کی تمام اقوام

متحد ہیں۔ بعض دوسرے ہندوستانی اصحاب نے بھی تقریریں کیں۔ اور پھر
بکر سامی بے نے فرانسیسی زبان میں رشید پاشا نے فارسی میں اور ڈاکٹر
نہاد پرشاد نے کچھ فرینچ میں اور کچھ انگریزی میں اپنے وفد کی طرف سے
جواب دیا، غرض دو تین گھنٹہ کی ہنگامہ آرائی کے بعد یہ تماشہ (جو لوگ ان
مضامین کے متعلق میری رائے سے متفق نہ ہوں۔ وہ معاف فرمائیں) ختم
ہو گیا۔

اس تماشہ کے بعد ہی ایک دوسرا سا ناگ کھیلایا گیا۔ جس میں۔ ڈاکٹر انصاری
مسٹر قدوائی اور سیٹھ چھوٹائی شریک نہ ہو سکے۔ ہندوستان کے نئے وائسرائے
لارڈ ریڈنگ کو لندن میں ایک خصوصی ضیافت ہندوستان کی ایک جماعت
کی طرف سے دی گئی۔ جس کے صدر ہرمانس آفا خاں صاحب تھے۔ ہم لوگو
کو بھی مدعو کیا گیا تھا۔ لیکن ہم نے یہ عذر کیا۔ کہ ہمارا اس قسم کی تقریب میں
شریک ہونا نان کو اپریشن کے اصول کے خلاف ہے۔ اور اگر نہ بھی ہو تب
بھی ہم کو اس طرح کی ضیافتوں میں شریک نہ ہونا چاہیے۔ درآنحالیکہ ہم
برطانوی حکومت کے ان نمائندوں سے یکسر مایوس ہو چکے ہیں۔ جن کو
ہندوستان کا حاکم بنایا جاتا ہے۔ آئندہ اگر لارڈ ریڈنگ کا طرز عمل اہل ہند
کے لئے مفید ثابت ہوا تو ہمیں انکی عنایتوں کا شکریہ ادا کرنے میں ذرا بھی
تامل نہ ہوگا۔ لیکن وقت سے پہلے ہم پیشگی قصیدہ خوانی کرنا نہیں چاہتے۔
اس موقع پر ہرمانس آفا خاں کی تقریر اس میں شک نہیں۔ کہ نہایت
زبردست تھی۔ اور چند روز اخبارات میں اس کا بہت چرچا رہا۔ مگر تقریریں
اور یہ چرچے اب ہمارے درد کی دوا نہیں ہیں۔

پھر ایک عہد انتظار!

۱۲ مارچ کی ملاقات کے بعد گو کہ وزیر ہند اور خود وزیر اعظم نے بھی وعدہ فرمایا تھا کہ ابھی پھر گفتگو کا موقعہ دیا جائے گا۔ مگر دس بارہ دن گزر گئے اور اس وعدہ کے ایفا کی کوئی صورت نظر نہ آئی۔ دو تین دفعہ وزیر ہند سے عرض کیا گیا۔ کہ

اُس نے کیوں بخشی ہے اپنے در کی در بانی مجھے! مگر وہ بھی کچھ نہ بتا سکے۔ کہ یہ عہد انتظار کب ختم ہوگا۔ یہ تو ہم خوب سمجھ چکے تھے۔ کہ برطانوی وزیر اعظم کی شخصیت کی ایک ادا یہ بھی ہے۔ کہ وہ نہایت بے نیاز ہیں۔ اور اپنے حلقہ اختیارات میں (جو بہت وسیع ہے) ایک خود مختار بادشاہ سے کم نہیں۔ ہم ہندوستان میں برطانوی حکام کی بیرخی اور بد مزاجی کو رو دیا کرتے ہیں۔ لیکن معلوم ہوا۔ کہ انگلستان میں خود وزیر اعظم اس فن کے اُستاد کامل سمجھے جاتے ہیں۔ ان کے روبرو وزیر ہند دفتر کے ہیڈ کلرک کی طرح دوڑتے ہیں۔ پہلی ملاقات میں ہم نے دیکھ لیا تھا کہ وہ ذرا ذرا سے کام کے لئے مسٹر مانیگو کو اشارہ کرتے تھے۔ معلوم نہیں یہ ان کی فطرت ہے یا پندار۔ بہر حال جو کچھ ہو بیچارے مانیگو صاحب بر طرف بھی اسی طرح کئے گئے۔ جیسے میں اپنے گاؤں کے کارندے کو جواب دیدوں! اس استعفیٰ اور اُس برطانی کا قصہ بھی بہت عبرت انگیز اور سبق آموز ہے! یہ موقعہ نہیں کہ میں کچھ تفصیل سے عرض کروں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ ایک خط جب اپنی بازی ”کھولنے“ کے لئے ضرورت سمجھتا ہے۔ جس مہرہ کو چاہتا ہے۔

کٹا دیتا ہے۔ مہرہ کے محسوسات شاطر کے کھیل کی ضروریات پر کوئی اثر نہیں رکھ سکتے۔ ہم اتنا ہی سمجھ لیں۔ تو کافی ہے۔ کہ برطانیہ کا موجودہ (اور اب سیاسی دنیا میں متوفی) وزیر اعظم جب اپنے دست و بازو۔ فوری ضروریات پر قربان کر سکتا ہے۔ تو پھر ہندوستانی غلاموں کی وہ امیدیں۔ جن کا مقطع سید حسن امام صاحب کا وہ پیغام ہے۔ جو انہوں نے ہندوستان واپس آکر اپنی درماندہ قوم کو سنایا تھا۔ ایک خوفناک سڑاب ہے! ایک ہیولہ ہے۔ پانی کا ایک بلبہ ہے۔ ایک فریب خیال ہے۔ اور بس۔

تو بہ دیگر اں چہ کر دی کہہ ماکنی نظیری
بخدا کہ واجب آمدز تو احترام کردن!

ہندوستانی وفد نے بھی وزیر اعظم کے شاہانہ مزاج کا کچھ مزا چکھا۔ یا تو پہلی ہی ملاقات میں الطاف و اکرام کی وہ بھرمار تھی۔ کہ تعریف و توصیف کے بارگراں نے مسٹر حسن امام کے کاندھے جھکا دیئے۔ یا پھر یہ بے نمکی تھی۔ کہ دوسری ملاقات کے لئے وقت مقرر ہونا محال ہو گیا۔ ہم تو کیا۔ خود وزیر ہند بھی معذور تھے۔ بہت سی یاد دہانیوں کے بعد ان کو کہنا پڑا۔ کہ وزیر اعظم سے ملنے کے لئے انتظار کی کھٹن گھڑیاں یوں ہی گزر کر تی ہیں، ہم نے خار جاؤنا کہ بعض اوقات سلطنت کے بڑے بڑے لوگوں کو وزیر اعظم سے ملنے کے لئے بہت کچھ کوہ کندن کرنی ہوتی ہے۔ وقت بھی مقرر ہو جاتا ہے۔ مگر در دولت پر حاضر ہوتے ہیں تو ٹوٹا دیئے جاتے ہیں! وزیر اعظم کو فرصت نہیں!

ہندوستانی ریاستوں کے درباروں میں یہ رنگ بہت دیکھا ہے۔ برطانوی ہندوستان کی رعایا بھی جانتی ہے۔ کہ صاحب کی ملاقات کے لئے کتنی دیر دیر درخت کے نیچے بیٹھنا پڑتا ہے۔ گرمی کے موسم میں ۱۲ بجے دن تک انتظار

کرنے کے بعد جب صرف دو تین منٹ کی ملاقات نصیب ہوئی تو وہ بھی
 ”دل فصل کا کیا حال ہے؟“ بارش کی ضرورت نہیں؟ وغیرہ کے بعد ”دل اچھا
 سلام“ کے ساتھ ختم ہو جاتی ہے۔ ہمارے ملک میں ”صاحب“ و ”سرکار“ کے یہ سب
 تماشے جزو زندگی ہو گئے ہیں۔ لیکن یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ کہ حاکمانہ بے نیازی
 کے یہی نمونے انگلستان کے گہوارہ حریت میں بھی نظر آئیں گے۔ اس
 عہد انتظار و التوا میں ایک دن تو ہمارے ساتھ بھی وہی معاملہ پیش آیا
 جو اکثر ریاستوں میں اہل غرض کو پیش آتا ہے یعنی ”سرکار“ اور ”حضور“ سے ملاقات
 کی امیدیں صبح سے عامہ باندھ کر اور چنہ پہن کر بیٹھ گئے۔ تو یوں ہی شام ہو گئی
 مگر چوہدار نہ آیا! ایک دن وزیر ہند نے ہم لوگوں کو بذریعہ ٹیلیفون اطلاع
 دی۔ کہ شاید آج وزیر اعظم وفد کو طلب فرمائیں۔ اس لئے کوئی گھر سے باہر نہ جائے
 اور ہر شخص تیار و منتظر رہے۔ چنانچہ ہم سب تیار ہو کر بیٹھ گئے۔ اور پہلے سے
 باہر جانے کے جو اوقات مقرر کر لئے تھے۔ ان سب کو مسترد کر دیا۔ اب
 گھر میں حاضر ہیں۔ گوش بر آواز ہیں۔ ٹیلیفون کے پاس بیٹھے ہیں۔ شام
 کو جواب ملا۔ کہ آج نہیں! شاید کل! پھر بھی ”شاید“ یہ شاید بے نیازوں
 کی بے نیازیوں کا ایک ہلکا عکس تھا۔ جو نیاز مندوں سے خراج نیاز مندی
 طلب کر رہا تھا۔ اور ہم تھے کہ ان ذلتوں کو فلسفیانہ انداز سے پی جاتے تھے!
 ہوں ترے وعدہ نہ کرنے پھی پھی کر کبھی - گوش منت کش گل بانگ تسلی نہ ہوا!

صحبتیں اور مشورے

اس زمانہ میں جبکہ پہلی ملاقات کے بعد دوسری ملاقات کے لئے دروازے

کھٹکھٹاتے جا رہے تھے۔ اراکین وفد دوست احباب کی ملاقاتوں میں وقت گزار رہے تھے۔ بعض اصحاب جلد ہندوستان جانا چاہتے تھے۔ مگر یہ بھی گوارا نہ تھا۔ کہ وزیر اعظم کا آخری جواب حاصل کئے بغیر چلے جائیں۔ مسٹر حسن امام اپنے پیشہ کے کاموں کی وجہ سے پابرجا رہے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب ہندوستان کے دوسرے قومی کاموں کو چھوڑ کر انگلستان میں وقت ضائع کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ بہر حال مجبور و معذور سب منتظر بیٹھے تھے۔ لندن سے باہر جانا بھی ممکن نہ تھا۔ مبادا ”چوہدار“ آئے اور ہم موجود نہ ہوں۔ وہاں رہ کر دوست احباب کی صحبتوں میں وقت گزارنے یا ہندوستان کی جدوجہد کے متعلق انگلستان کے سیاسی حلقوں میں کچھ کام کرنے کے سوا کوئی دوسرا مشغلہ نہ تھا۔ ترکی وفد بھی لندن سے رخصت ہو چکے تھے۔

وزیر اعظم سے دوسری ملاقات ہنوز ایک وعدہ فروا تھا۔ اس عرصہ میں ایک ترک دوست طلعت بے نے جو لندن میں مقیم ہیں۔ ہم سب کو ایک شب کھانے پر مدعو کیا میری عمر میں یہ پہلا موقع تھا۔ کہ میں نے کسی ترک کے گھر میں بیٹھ کر کھانا کھایا۔ ترکی کھانوں کا مزہ بھی پہلی دفعہ چکھا۔ اور دو مہینہ تک بے نمک اُبے ہوئے گوشت کے ٹکڑے اور کچی ترکاریوں کے کھانے کے بعد طلعت بے کا دسترخوان گویا آسمانی نعمتوں سے بھرا ہوا پایا۔ ہر رقمہ پر ہندوستان یاد آیا۔ بلکہ بعض چیزیں تو ہندوستان کے کھانوں سے بھی لذیذ تر تھیں۔ تین چار نئے نئے ترک ہماری گودوں میں بیٹھے تھے۔ گویا انہوں نے جاننے کی وجہ سے ہم اپنی محبت کا پیام صرف نظر سے ابراشاروں سے ان تک پہنچا سکے۔ کس قدر خوب صورت۔ تندرست اور چست و چالاک نچتے تھے۔ میں ان کی

صورتیں دیکھتا تھا۔ اور دل میں کہتا تھا۔ اے رب العالمین کیا مجاہدین اسلام کی فیسیلیں اپنے آبا و اجداد کی شاندار وراثت سے محروم کر دی جائیگی۔ ان کے ہاتھ میں تلوار ہوگی یا کاسہ گدائی یا زنجیریں؟ ان کے خوبصورت چہرے اور مضبوط جسم دیکھ کر مجھے ہندوستان کے بسورتے ہوئے اور نیم جان بچے یاد آتے تھے۔ دل کہتا تھا۔ کہ ابھی ترکوں کی نسل میں دم باقی ہے۔ اگر عزت کے ساتھ زندہ رہنے کا دم باقی نہیں۔ تو کم از کم سپاہیوں اور مجاہدوں کی طرح مرنے کا دم ضرور باقی ہے۔ انشا اللہ۔

۱۶ مارچ کی شب میں لندن کے ہندوستانیوں نے ترکی وفد کو ایک ضیافت دی۔ جس میں علاوہ بہت سے معزز اصحاب کے چند خواتین مسٹر اصفہانی۔ مسٹر حسن امام۔ مسر دوپے بھی شریک تھیں۔ مسٹر اصفہانی نے بحیثیت صدر کے ایک دلچسپ تقریر فرمائی۔ ان کے بعد مسٹر حسن امام نے ہندوستان اور خلافت کے متعلق ایک زبردست تقریر کرتے ہوئے صاف صاف کہا۔ کہ اگر خلافت کے متعلق اقوام ہندوستان کے متحدہ مطالبات پر توجہ نہ کی گئی۔ اور انگلستان نے اپنے وعدے پورے نہ کئے۔ تو وہ ہندوستان کو سلطنت برطانیہ سے جدا ہونے پر مجبور کر دے گا۔ اگر مجوزہ ترمیمات کو ترک منظور بھی کر لیں تب بھی ہندوستان رضامند نہ ہوگا۔ اس تقریر کے متعلق لندن کے اخبارات اور خصوصاً ٹائمز نے مسٹر حسن امام پر سخت نکتہ چینی کی جس کا صاحب موصوف نے ایک تحریر کے ذریعہ سے جواب بھی دیا۔ مگر اس کو ٹائمز نے چھاپنے سے انکار کر دیا۔ بکرا ساجی بے نے میزبانوں کا شکریہ ادا کرتے ہوئے یقین دلایا۔ کہ ترک مرنا اور تباہ ہو جانا قبول کریں گے۔ بجائے اس کے کہ کسی ذلیل کرنے والی صلح پر رضامند ہوں۔

اجاب کی صحبتوں کا یہ سلسلہ جاری تھا۔ صبح سے شام تک آکسفورڈ و کیمبرج کے نوجوان طلبہ آتے رہتے تھے۔ اخبارات کے نمایندوں کا حملہ کچھ کم تو ہو گیا تھا۔ مگر ختم نہ ہوا تھا۔ خدا خدا کر کے اطلاع ملی کہ ۲۴ مارچ کی سہ پہر کو وزیر اعظم ستم کشان انتظار کو دوسری دفعہ شرف باریابی عطا فرمائیں گے۔

دوسری ملاقات

اس دفعہ چونکہ دارالعوام کا اجلاس ہو رہا تھا اس لئے وزیر ہندو ماں مصرود تھے۔ اور ہمارے ساتھ شریک نہ ہو سکے۔ ہنرمائیں آغا خان بھی لندن سے جا چکے تھے۔ البتہ دفتر ہند کے ایک دوسرے عہدہ دار ہم کو لے کر ایوان پارلیمنٹ میں گئے۔ جہاں وزیر اعظم کے کمرہ میں ملاقات قرار پائی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا۔ کہ میں نے لندن کے اُس گہوارہ حقوق انسانیت (اس انسانیت میں کالے رنگ کی انسانیت شامل نہیں ہے) میں قدم رکھا جو دنیا کے آئین جمہوری کی ماں کہی جاتی ہے۔ گو کہ جہاں تک ہندیوں کا تعلق ہے۔ اس ماں کے بطن سے ہمارے لئے ایک چوہے کا بچہ بھی پیدا نہ ہو سکا! ایسٹمنسٹر کی تاریخی عمارت میں پہلی دفعہ داخل ہو کر جس چیز نے سب سے پہلے اپنی طبیعت پر ایک غیر خوشگوار اثر ڈالا وہ اس عمارت کی تاریکی اور خاموشی تھی۔ دیواریں بلند ہیں۔ درہنچوں میں خوبصورت شیشے لگے ہوئے ہیں۔ مگر جن ابتدائی کمروں سے ہم گزرے وہ کچھ عجب تاریک و غیر آباد ویران اور خاموش نظر آتے تھے۔ ہر طرف برطانوی مدبرین و مشاہیر کے مجسمے نصب تھے۔ یہ محسوس ہوتا تھا۔ کہ گویا ان مجسموں کی ارواح اس تاریکی میں سرایت کر گئی ہیں۔ اور اس طرح

آپس میں سرگوشیاں کر رہی ہیں۔ کہ انسانی زندگی کی حرکت بالکل بند ہے۔ کیا عجب ہے۔ کہ اس شہر غموشاں میں کسی دن گلیڈسٹن کے روح نے مسٹر لائڈ جارج اور لارڈ کرزن کے قدم چومے ہوں! حالانکہ پارلیمنٹ کا اجلاس ہو رہا تھا۔ مگر باہر کے کمروں میں ایک سناٹا تھا۔ میرے تخیل میں برطانوی دارالعوام کی تصویر ہی کچھ اور تھی۔ میں تو سمجھتا تھا۔ کہ ایک چہل پہل ہوگی۔ ممبرانِ عوام ملک ادھر سے ادھر پھر رہے ہوں گے۔ اہل عملہ بغل میں کاغذات لئے بھاگ رہے ہوں گے۔ اعلیٰ افسروں کی جگہ گاتی وردیاں نظر آئیں گی۔ ایک گھامبھی ہوگی۔ لیکن وہاں سوائے پولیس کے دو چار افسروں کے کوئی بھی نہ تھا۔ بکو وزیراعظم کے کمرہ تک پہنچنے میں دو چار جگہ رُکنا پڑا۔ دارالعوام میں کوئی شخص بغیر اجازت کے داخل نہیں ہو سکتا۔ عوام کا ذکر کیا ہے۔ خاص خاص آدمیوں کو بھی پروانہ راہداری کی ضرورت ہے! چنانچہ پہلے دفتر ہند کے افسر کے ذریعہ سے جو ہمارے ساتھ تھے داخلہ کے ٹکٹ حاصل کئے گئے۔ پھر وہ ٹکٹ دو تین دروازوں پر پولیس کو دکھائے گئے۔ تب کہیں بارگاہ وزارت تک گزر ہوا۔ ایک تنگ برآمدے میں تین چار چھوٹے چھوٹے کمروں کے دروازے نظر آتے ہیں۔ جو غالباً مختلف وزرائے کمرے ہیں۔ ایک دروازہ پر مسٹر ایکویتیہ کا نام بھی لکھا ہوا تھا۔ آخری کمرہ سے ملا ہوا ایک کمرہ وزیراعظم کے پرائیویٹ سکرٹری کا ہے۔ پہلے وہاں حاضر ہوئے۔ اور چند منٹ بعد پرائیویٹ سکرٹری ہم کو وزیراعظم کے کمرے میں لے گئے۔ کمرہ جمہور و صبیح کے آڈیٹر کے کمرے سے بڑا نہ تھا۔ وزیراعظم کی پشت پر آئینہ ان تھا۔ اور سامنے دفتر کی ایک معمولی میز تھی۔ مسٹر لائڈ جارج وہی تھے۔ جن کو پہلے دیکھا تھا۔ یعنی صورت شکل وہی تھی۔ مگر تیور دوسرے تھے۔ جیسے کسی کا جگر یا معدہ خراب ہو۔ یا شب

کو نیند نہ آنے یا بد خوابی کی وجہ سے صبح کو مزاج چڑچڑا ہو۔ یا صبح کے ناشتہ کے متعلق باورچی نے کوئی خطا کی ہو؛ غرض معمولی مراسم ادا ہوئے۔ اور ہم لوگ بٹھانے گئے۔ نشست کی صورت یہ تھی۔ کہ وزیر اعظم کی میز کے سامنے ایک چھوٹی سی میز اور تھی۔ اُس کے گرد ہم سب بیٹھ گئے۔ سید حسن امام صاحب نے گفتگو شروع کی۔ مگر آج اُن کا رنگ بھی پھیکا اور ہلکا تھا۔ جیسے کسی کے قدم رکتے ہوں۔ اور راستہ صاف نظر نہ آتا ہو۔ بہت ممکن ہے۔ کہ وزیر اعظم کے تیور نے سید صاحب کے خیالات کو منتشر کر دیا ہو۔

بہر حال اس ملاقات میں گفتگو کا سلسلہ اُس تحریر کے حوالہ سے شروع ہوا۔ جو وزیر اعظم کی خواہش کے مطابق تیار کر کے بھیجی گئی تھی۔ گو کہ مسٹر لائڈ جارج نے بھی فرمایا۔ کہ وہ اس تحریر کو نہایت غور کے ساتھ پڑھ چکے ہیں۔ لیکن صاحب موصوف کے طرز کلام سے یہ معلوم تھا۔ کہ ان کی گفتگو ہماری تحریر پر مبنی نہیں ہے۔ اور نہ بحث کی غرض یہ ہے۔ کہ کوئی سمجھوتا ہو بلکہ وزیر اعظم کے ذہن میں فیصلے موجود ہیں۔ اور اُن ہی کے مطابق دلائل تیار کر لئے گئے ہیں۔ اور وہ اب پیش کئے جا رہے ہیں۔ تاکہ ہماری رائے کو متاثر کیا جائے۔ ایک کاغذ صاحب موصوف کے سامنے تھا۔ جس کو وہ دیکھتے جاتے تھے۔ کیا تھا۔ معلوم نہیں۔ پرائیویٹ سکرپٹی مسٹر فلپ کار (جن کی ہوشمندی کو دیکھ کر لوگ کہتے ہیں۔ کہ کسی زمانہ میں ان وزیر اعظم ہو جانا ناممکن نہیں!) ہر معاملہ میں وزیر اعظم کے دست راست ہیں۔ وہ پاس ہی موجود تھے۔ اور جب ایک دو دفعہ کوئی الجھن پیدا ہوئی۔ اور وزیر اعظم ذرا اُس کے تو مسٹر کار نے فوراً اُٹھ کر ان کے کان میں کمک پہنچا دی!

مسٹر حسن امام نے پہلی ملاقات کی طرح اس دفعہ بھی دوران گفتگو میں با

بار اس حقیقت کو عرض کیا۔ اور سمجھایا۔ کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ یا وہ مذکی طرف
 سے جو خیالات ظاہر کئے جا رہے ہیں۔ وہ سب مسلمانان ہند اور ان کی ہموطن
 اقوام کے خیالات ہیں۔ ترکوں نے کیا کہا۔ اور کیا نہ کہا۔ اس سے ہم کو کوئی بحث
 نہیں۔ اس لئے کہ ہمارے مطالبات کی نوعیت وہ ہے۔ جس کو ترک بھی
 ماننے پر مجبور ہیں۔ جہاں تک مذہبی احکام کا تعلق ہے۔ جو ہمارے اکثر مطالبات
 کی بنا ہیں۔ ترک بھی وہی مذہب رکھتے ہیں۔ جو ہمارا ہے۔ اتحادیوں کی نا انصافی
 پر ترک بھی اُسی طرح زور دے رہے ہیں۔ جس طرح ہم زور دے رہے ہیں۔
 ترکوں اور اہل ہند کے مطالبات میں اختلاف کی کوئی صورت ہی نہیں۔ مگر
 وزیر اعظم پر جب کبھی ہمارا کوئی مطالبہ اُن پر گراں گزرتا فوراً یہ دلیل لاتے تھے۔
 کہ ترکوں نے تو ایسا نہیں کہا۔ ترک تو یہ مطالبہ نہیں کرتے وغیرہ وغیرہ تعجب
 ہے۔ کہ ہر تین منٹ کے بعد مسٹر لائڈ جارج بھول جاتے تھے۔ کہ ہمارے
 مطالبات ہندوستان کی عام رائے۔ برطانیہ کے وعدوں اور سب سے زیادہ
 شریعت اسلامی پر مبنی ہیں۔ ہمیں اس سے بحث نہیں۔ کہ ترکوں نے کیا
 کہا۔ ہمیں تو بحث اس سے ہے۔ کہ وزیر اعظم نے ہم سے کیا وعدے کئے تھے۔
 اور ہم نے کن وعدوں کی بنا پر ترکوں کے خلاف تلوار اٹھائی تھی۔ ہمیں اس
 سے بحث نہیں۔ کہ ترک ہمارے مطالبات کی تائید کرتے ہیں یا نہیں کرتے۔
 ہم تو صرف یہ دیکھتے ہیں۔ کہ حق و انصاف بھی ہمارا موید ہے یا نہیں۔ ہمیں
 اس سے بحث نہیں۔ کہ ترکوں سے اور اتحادی وزرا سے کیا گفتگو ہوئی ہندو
 اور برطانیہ کا معاملہ جُدا ہے! مسٹر حسن امام نے مختصراً اُن تمام مباحث کو دہرایا
 جو یادداشت میں پیش کئے گئے تھے۔ جب انہوں نے خلیفہ المسلمین کی سیادت
 کے متعلق کچھ کہنا شروع کیا۔ تو وزیر اعظم جو اب تک خاموش تھے۔ ذرا سنبھل

بیٹھے اور سوال کیا کہ آپ عرب ریاستوں پر بھی سلطان کی سیادت چاہتے ہیں؟ مسٹر حسن امام نے جواب دیا کہ ہم صرف مذہبی سیادت چاہتے ہیں نہ مادی۔ معصومانہ انداز سے ارشاد ہوا کہ ہمیں اس مذہبی مسئلہ سے کیا تعلق! یہ تو مسلمانوں کا حق ہے جس کو چاہیں خلیفہ مانیں۔ انگلستان نے تو کبھی اس خالص مذہبی معاملہ میں دخل نہیں دیا۔ مسٹر حسن امام نے وزیر اعظم کو بتایا کہ مسلمانوں کو مجوزہ عہد نامہ کی دفعہ ۱۳۹ اس بارہ میں زیادہ متردد کرتی ہے۔ وزیر اعظم کے جواب سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ ہمارے مطلب کو اچھی طرح سمجھ گئے۔ فرمانے لگے کہ کیا آپ اُن الفاظ کا حوالہ دے رہے ہیں کہ سلطان کو غیر ممالک کے مسلمانوں پر کسی قسم کا حق باقی نہ رہے گا۔ مسٹر حسن امام نے کہا کہ میرا مطلب یہی ہے۔ اب حسب معمول وزیر اعظم کی بحث نے فوراً ایک دوسرے پہلو کی طرف گریز کی اور فرمانے لگے کہ کیا خلیفہ اسلام کی مذہبی سیادت اسی قسم کی ہے جس قسم کی کہ عیسائی دنیا میں پاپاے روما کی سیادت ہے۔ سید حسن امام صاحب نے کہا کہ دونوں چیزیں مختلف ہیں۔ اس وقت یہ بحث کچھ عرصہ تک جاری رہی۔ اور مسٹر لائڈ جارج اسی پر زور دیتے رہے کہ خلیفہ کی حیثیت وہی ہے جو پاپاے روما کی۔ دنیا میں رکھتا ہے۔ ان کا دماغ اس نکتہ کے سمجھنے سے قاصر رہا۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ عہد جدید کے ”روشن خیال“ نوجوان ترک بھی اس کی صحیح اہمیت سمجھنے میں قصور کر رہے ہیں۔ قوم فروش وحید الدین کے بعد (اپنے دوسرے سفر یورپ کے تجربات کی بنا پر کہتا ہوں) عہد الجید آفندی خلیفہ کے اُس اصلی منصب سے فی الحال محروم ہیں۔ (شرعیات اسلامی کے اس مفہوم کے مطابق جو ہم کو ہمارے علما نے سمجھایا ہے) جس کے اندر حکومت اور خلافت کے اختیارات جدا نہیں ہو سکتے۔ میں اس دوسرے سفر یورپ کے دوران میں جو ۱۶ جنوری ۱۹۲۳ء کو ختم

ہوا ہے۔ لوزان بھی گیا تھا۔ جہاں صلح کالفرنس کے بہت سے ترک شرکاسے گفتگو کا موقع ملا۔ جنرل عصمت پاشا سے دو گھنٹہ تک صرف مسئلہ خلافت پر ایک طویل گفتگو ہوئی۔ میں ابھی اپنے اُن خیالات کو پیش کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں جو اس دوسرے سفر کا نتیجہ ہیں۔ لیکن رکتے رکتے اتنا کہہ دینا چاہتا ہوں۔ کہ اس وقت ترکوں کے درمیان مختلف خیالات رکھنے والی جماعتیں موجود ہیں اور اس خاص مسئلہ کے متعلق جمعیت ملیہ انگورہ کے آزاد خیال لیڈروں کے اندر خلیفہ کے دینی اور مذہبی منصب کی اہمیت کا خیال بہت دھندلا اور کمزور ہے۔ غالباً اس خیال سے غازی مصطفیٰ کمال اور عصمت پاشا جیسے مقتدر حضرات اتفاق نہیں کرتے۔ نہ انا طولیہ کے عامۃ الناس اس بحث میں پڑتے ہیں۔ مگر ان کے نوجوان لیڈر اسلامی قومیت کو یورپین نقطہ نظر سے دیکھ رہے ہیں۔ اور یہ ایک بہت بڑا خطرہ ہے۔ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ یورپ میں پاپائے روم کی حقیقت سوائے اس کے کچھ نہیں۔ کہ وہ کیتھولک مذہب کی محدود دنیا سے نڈر اندھو کیا کرے۔ اور چند عہدے تقسیم کر دیا کرے۔ میں پہلے کسی مقام پر عرض کر چکا ہوں۔ کہ یورپ میں کوئی قومیت مذہب پر مبنی نہیں۔ اس لئے کیتھولک قومیت کا درد بہت کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ جو کیتھولک جس سلطنت میں رہتے ہیں۔ عموماً اسی سلطنت کی قومیت میں شریک ہوتے ہیں۔ لیکن برخلاف اس کے مسلمان خواہ کسی ملک اور کسی سلطنت میں رہیں۔ تاہم بحیثیت مجموعی ساری دنیا میں باوجود اختلافات تہذیب و نسل و رنگ و زبان ان کی قومیت ایک ہی ہے۔ اور اس قومیت کے شیرازہ کی باگ ازروے مذہب حقہ خلیفہ اسلام کے ہاتھ میں ہے۔ قصہ مختصر سٹرلائڈ جارج سے ہماری اس بحث کا یہ حصہ مہمل ہو کر رہ گیا۔ وزیر اعظم نے بھی برطانوی تدبیر کا وہی پُرانا نسخہ پیش کر دیا۔ کہ برطانیہ کبھی

کسی مذہبی معاملہ میں دخل نہیں دیتا۔ مسٹر حسن امام اپنی قانونی بحث پیش کرتے تھے۔ اور اُدھر سے بجائے اس کے کہ وزیر اعظم کسی دلیل و برہاں سے متاثر ہوتے یا اُس کی تردید کرتے اُسی ایک سبق کو دہراتے رہے۔ کہ ”ہم سے ترکوں نے اس کے متعلق کچھ نہیں کہا۔“ اور یہ کہ ”ہم تو کبھی کسی کے ایسے معاملہ میں دخل نہیں دیتے۔“ بہت کرم فرمایا۔ تو یوں ارشاد ہوا۔ کہ ”میں اس معاملہ کو یادداشت میں لکھ لیتا ہوں۔ کہ جب ترکوں سے قطع فیصلہ ہو تو میں اس معاملہ کو صاف کر دوں۔“ اگر یہ کوئی وعدہ ہے۔ تو اس کے صحیح مفہوم کو سمجھنے کے لئے مجھ سے بہتر دماغوں کی ضرورت ہے! میں تو کچھ نہ سمجھا۔ کہ یادداشت میں لکھ لینے اور ترکوں سے قطع فیصلہ کرنے کے وقت اس معاملہ کو صاف کر دینے کا مطلب کیا ہوا اسی سلسلہ گفتگو میں پھر ایک مرتبہ ارشاد ہوا۔ کہ ”ہمیں تو اس بات پر فخر ہے۔ کہ ہماری سلطنت میں کسی کے مذہبی عقاید سے تعرض نہیں کیا جاتا۔ بالکل سبھا فرمایا! مذہبی عقاید سے کبھی تعرض نہیں کیا جاتا۔ اور کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جاتا۔ کہ وہ اپنے کسی عقیدہ کو جو اس کے دل میں جاگزیں ہو دل سے نکال دے۔ مگر کیا ہندوستان میں مذہبی عقاید پر عمل کرنا بھی آسان ہے؟ خلافت کے متعلق ہمارے عقاید سے کوئی تعرض نہیں۔ لیکن اگر ہم اُن عقاید کی بنا پر ترکوں کے خلاف لڑنے سے انکار کریں۔ یا اب کہ برطانیہ جنگ سے فارغ ہو چکا ہے اور غیر جنبہ دار ہے۔ یونان کے خلاف ترکوں کو مدد دینا چاہیں تو ایسا کرنے کی عاٰ اجازت مل سکتی ہے؟ پہلی ملاقات میں ہنزاسٹینس آغا خان جیسے ”اعتدال پسند“ نے عرض کیا تھا۔ کہ برطانیہ غیر جنبہ دار ہے تو غیر جنبہ دار ہے۔ مگر ہم کو اجازت عطا ہو کہ ہم یونان کے خلاف ترکوں کی اعانت کریں۔ میں گزشتہ صفحات میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ اس معروضہ کا جواب کیا ملا! لاریب کہ رعایا کے مذہبی عقائد

سے ذرا تعرض نہیں کیا جاتا۔ لیکن اُن عقاید پر بہر حال عمل کرنے کی آزادی دینا یہ ایک دوسرا سوال ہے! اس سوال کا جو اب ضرورت ہو تو مقدمہ کراچی کی روئیداد سے کافی و ثانی دیا جاسکتا ہے۔ وہ سارا مقدمہ مذہبی عقاید کی بحث پر مشتمل ہے۔ اور ملزمین (خصوصاً مولانا محمد علی صاحب) نے تو اپنے بیانات میں اس حقیقت کو اچھی طرح واضح کر دیا ہے۔ کہ مذہب اور عقاید کی آزادی اور عام مذہبی رواداری کا عملی مفہوم برطانوی ہندوستان میں کیا ہے۔ میرے لئے اس موقع پر ضرورت نہیں۔ کہ اس اہم ترین بحث کو پھیڑوں ہندوستان کا ہر مسلمان مقدمہ کراچی کی روئیداد پڑھ چکا ہے *

غرض الفاظ کی یہ شطرنج خوب کھیلی گئی۔ جیسی کہ اکثر کھیلی جاتی ہے۔ افسوس یہ ہے۔ کہ ہمارے ترجمان نے وزیر اعظم کی جادو بیانی سے بار بار دھوکہ کھایا۔ بچانے اس کے کہ وہ مذہبی عقاید پر عمل کرنے کی آزادی کا سوال اٹھاتے اپنا راستہ بھول کر دوسری طرف جانچے۔ اور حقوق انسانیت کے بنیادی اصولوں پر ایک ضرب لگا دی۔ انڈین نیشنل کانگریس کے سابق پریسیڈنٹ نے فرمایا۔ کہ اگر آپ ہم کو اس امر کا یقین دلا دیں (کہ آپ کی پالیسی یہ ہے۔ کہ مذہبی عقاید سے تعرض نہ کیا جائے) اور اگر برطانوی سلطنت کے مسلمانوں کے مذہبی جذبات ملحوظ رکھے گئے۔ اور ان کو تسکین قلب دی گئی۔ تو کیا وہ پھر بھی کسی دوسری گورنمنٹ کے تحت میں رہنا چاہیں گے؟ وہ کیوں ایسا چاہیں گے؟ وہ تو خود ایک ایسی حکومت کے تحت میں زندگی بسر کرنا پسند کریں گے۔ جو ان کے مذہبی محسوسات میں ان کو آزادی دیتی ہے۔ حیران ہوں۔ کہ سید صاحب کہاں سے کہاں پہنچ گئے! صاحب موصوف نے شاید یہ سمجھا ہو۔ کہ ان الفاظ کے ذریعہ سے وزیر اعظم کو وہ بہ اسلوب احسن یہ بتا رہے ہیں۔ کہ

اگر طمانیت نہ دی گئی۔ تو ہندوستان آپ کی حکومت میں رہنا پسند نہ کرے گا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے اپنی غفلت میں ہندوستانی قوم پرستوں کے بنیادی اصولوں پر ٹھوکر مار دی۔ ہوم رول و سوریج کے سارے تخیل کو درہم و برہم کر دیا۔ وزیراعظم کو ذرا سی ڈھکی ہوئی ڈھکی دینے کے لئے (جب کی ضرورت نہ تھی) اور تھی تو صاف الفاظ میں تھی) سید صاحب نے ہندوستان کی جدید قومیت کے سنگ بنیاد پر بے تحلف ایک ضرب لگا دی۔ ایک پتے کے حاصل کرنے کے لئے سارے درخت کی جڑ کو اکھیڑنے کی کوشش کرنا ایک ذوق غلط اندیش کی دلیل ہے۔ میں سید صاحب کی نیت پر حملہ نہیں کر سکتا۔ اور خواہ اختلاف آپ کچھ ہی ہو۔ مگر مجھے کبھی یقین نہ آئے گا۔ کہ سید حسن امام صاحب ہندوستان کے مطلع نظر سے۔ بلکہ تمام دنیا کی محکوم اقوام کے مشترکہ مطلع نظر سے۔ استقدر بے پروا ہونگے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ وزیراعظم کی کسی ادا نے انہیں متاثر کیا اور وہ نادانستہ ایک ٹھوکر کھا گئے۔ حالانکہ حقوق انسانیت کے اس بدیہی اصول کو ان کے مرتبہ اور قابلیت کا کوئی شخص نظر انداز نہیں کر سکتا۔ کہ آزادی و حکومت خود اختیاری اس لئے طلب کی جاتی ہے۔ کہ وہ انسانوں کے فطری حقوق میں اس کا عزیز ترین حق ہے۔ اور یہ کہ نا انصافیوں اور جاہلانہ حکومت کے متعلق اگر کوئی طمانیت حاصل ہو سکتی ہے تو وہ یہی صرف یہی ہے۔ کہ آئندہ حکومت کی باگیں اپنے ہاتھ میں ہوں۔ قومیں۔ غیر قوموں کی حکومت کو کسی حال میں بھی پسند نہیں کر سکتیں۔ خواہ وہ غیر قومیں کتنی ہی عدل گستر اور انصاف پرور ہوں۔ دنیا کی محکوم اقوام عدل گستری اور انصاف پروری کی طالب نہیں۔ وہ سب اپنے اوپر اپنی حکومت چاہتی ہیں۔ خواہ وہ کیسی ہی ہو اہم نے کبھی نہیں کہا نہ ہم کہہ سکتے ہیں۔ کہ اگر خلافت کے معاملہ میں انصاف کیا

جائے گا۔ تو ہم سواراج کے مطالبہ سے دست بردار ہو جائیں گے۔ آزادی کا مطالبہ تو صرف اس لئے ہے۔ کہ آزادی انسانیت کا فطری حق ہے۔ زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتا ہے۔ کہ (جیسا کہ کانگریس کا عقیدہ ہے) سلطنت برطانیہ میں دوسرے شرکاء کے ساتھ ایک مساوی درجہ حاصل کر کے ہندوستان بھی اس سلطنت کے آزاد اجزاء میں سے ایک جزو قرار پائے۔ اور ایک ہی بھند کے تیچے اپنے وجود کو اس طرح قائم کر لے کہ آئندہ کالے اور گورے کا کوئی امتیاز باقی نہ رہے اور مساوی حقوق کے ساتھ ہندوستانی قوم بھی برطانوی نوآبادیوں کے دوش بدوش کھڑی ہو سکے۔ اگر پنجاب کا معاملہ پیش نہ بھی آیا ہوتا۔ اگر خلافت کا مسئلہ پیش نظر نہ بھی ہوتا۔ تب بھی آج نہیں تو کل سواراج کا سوال یقیناً پیدا ہوتا۔ اس لئے کہ یہ اقتضائے فطرت انسانی ہے۔ اور دنیا کی کوئی قوم کسی دوسری قوم کو ہمیشہ محکوم نہیں رکھ سکتی۔ فطرت الہی خود اس مطالبہ حقوق انسانیت کی ضامن ہے۔ میں تو کہتا ہوں۔ کہ اگر بغرض محال کسی دن ہندوستان والے انگلستان پر یا کسی غیر ملک پر مسلط ہو جائیں اور وہاں اُسی طرح کی حکومت قائم کر دیں۔ جس طرح آج ہندوستان میں قائم ہے۔ تو وہ انسان کے فطری حقوق کو پامال کریں گے۔ جس طرح آج ہندوستان میں ہو رہے ہیں۔ قدرت کے جغرافی اور فطری تقسیم کے خلاف جو قوم بھی قدام بڑھائے گی۔ غلطی کریگی۔ سید حسن امام صاحب کے الفاظ نہ صرف قوم پرستوں کے مطالبہ آزادی سے متصادم ہوئے بلکہ وہ تو اعتدال پسند فریق کے مطمح نظر سے بھی شکر اگئے!

اس کے بعد بعض دوسرے مسائل پر جو ہماری یادداشت میں درج تھے۔ بحث ہوتی رہی، دوران گفتگو میں امیر فیصل کے متعلق ایک دلچسپ واقعہ

پیش آیا۔ یہ حضرت جو عرصہ تک اپنی ایمان فروشی کا صلہ پانے کی امید میں اتحادیوں کے ممالک میں دیروزہ کرتے پھرتے تھے۔ اُس وقت لندن میں موجود تھے۔ اور ہندوستانی وفد کے پاس چونکہ آپ کا پیام آیا تھا۔ کہ میں ملنا چاہتا ہوں۔ اس لئے ایک دن سید حسن امام صاحب ڈاکٹر انصاری اور مسٹر قدوائی انکی خدمت میں گئے۔ اور انکی زبان سے ان کے خیالات سُن آئے۔ برسبیل تذکرہ وزیراعظم نے یہ ظاہر کیا۔ کہ خود امیر فیصل بھی عراق عرب میں برطانوی حکمرانسی (Mandate) کو پسند کرتے ہیں۔ حالانکہ اراکین وفد سے امیر صاحب کچھ اور ہی فرما چکے تھے۔ جب سید حسن امام صاحب نے وزیراعظم کو بتایا۔ کہ امیر فیصل برطانیہ کی حکمرانی کو ہرگز پسند نہیں کرتے۔ اور خود اراکین وفد سے اپنا یہ خیال ظاہر کر چکے ہیں۔ تو مسٹر لائڈ جارج بہت چراغ پا نظر آئے۔ بار بار حیران ہو کر سوال کرتے تھے۔ کہ کیا واقعی اُس نے تم سے ایسا کہا۔ ہم سے تو کبھی ایسا نہیں کہا۔ پھر ازراہ استہزا فرمانے لگے۔ کہ شاید امیر فیصل ہمارا (Mandate) نہیں چاہتا۔ صرف ہمارا روپیہ لینا چاہتا ہے! اس واقعہ کے بعد امیر فیصل اور مسٹر لائڈ جارج کے درمیان کیا گزری ہمیں معلوم نہیں۔ بہر حال ہزار وقتوں اور رسوائیوں کے بعد اب اس دُنیا طلب کو اپنے گناہوں کی مزدوری مل گئی۔ اور وہ عراق کا بادشاہ بن گیا۔ کون کہہ سکتا ہے۔ کہ گناہوں کی یہ کمائی کتنے عرصہ تک ساتھ دیگی!

عراق عرب کے متعلق جب وزیراعظم پر زیادہ زور دیا گیا۔ کہ برطانوی فوجیں وہاں سے ہٹائی جائیں اور ان کو بتایا گیا۔ کہ فرانس ترکوں کے حقوق کو اچھی نظر سے دیکھ رہا ہے۔ تو صاحب موصوف نے بہت ہی

چیں بچیں ہو کر فرمایا۔ کہ اگر فرانس کو ترکوں سے اس قدر ہمدردی ہے۔ تو وہ شام سے کیوں واپس نہیں آتا؟ شیخ قدوائی صاحب نے جواب دیا۔ کہ اگر آپ عراق عرب سے واپس چلے آئیں گے۔ تو فرانس یقیناً شام کو خالی کر دے گا۔ اس جواب کو سن کر وزیر اعظم نے گفتگو کا رخ معاً دوسری طرف پھیر دیا!

جب قسطنطنیہ کے متعلق بحث شروع ہوئی تو مسٹر صحن امام نے وزیر اعظم کو بتایا۔ کہ نہ صرف سمندر کی طرف سے بلکہ خشکی کی طرف سے بھی قسطنطنیہ بال غیر محفوظ رہے گا۔ اس لئے کہ یونانی اگر خطوط چٹا لچہ تک قابض رہیں گے تو وہ ہر وقت قسطنطنیہ پر حملہ کر سکیں گے۔ پس یہ کہنا۔ کہ قسطنطنیہ ترکوں کے قبضہ میں چھوڑ دیا گیا۔ محض طفل تسلی ہے۔ جبکہ ہم دیکھتے ہیں۔ کہ سمندر اور خشکی دونوں جانب سے وہ دشمنوں کے حلقہ میں محصور ہے۔ اس کا جواب کس قدر معقول ملا۔ یعنی یہ کہ خطوط چٹا لچہ ہی پر ترکوں نے بلغاریہ کی فتح یا ب فوج کو روکا تھا۔ خطوط چٹا لچہ دنیا کے سب سے زیادہ مضبوط استحکامات میں شمار کئے جاتے ہیں۔ حیران ہوں۔ کہ برطانوی وزیر اعظم کس قدر جلد جرمینوں کی اُن توپوں کو بھول گئے۔ جنہوں نے اینٹورپ۔ لیئٹر اور تمور کی ناقابل تسخیر استحکامات کو پاش پاش کر دیا تھا۔ جو ساحل فرانس سے ساحل انگلستان پر گولہ باری کر سکتی تھیں اور جنہوں نے سپاس میل کے فاصلے سے پیرس کو تباہ کر دیا تھا۔ حالانکہ خطوط چٹا لچہ تو قسطنطنیہ سے بہت ہی قریب ہیں۔ اور اپنے دوستوں کی عنایت سے یونان کا اس قسم کی بڑی توپیں استعمال کرنا کچھ مشکل بھی نہیں!

مسٹر لائیڈ چارج کی گفتگو لطائف و ظرائف سے بھی خالی نہ تھی۔ اور بعض وقت تو میں بہت ہی لطیف انداز ہوتا تھا۔ مثلاً نوجوان ترکوں کی غلطیوں

پرافسوس فرماتے ہوئے وزیراعظم کو سلطان عبدالحمید خاں مرحوم یاد آئے اور ارشاد ہوا۔ کہ اگر عبدالحمید زندہ ہوتے تو ترکوں کی یہ گت نہ ہوتی۔ اور اس کے بعد تمام وہ مجبوریاں جنگی وجہ سے ترکوں کے خلاف کاروائی کرنی پڑی۔ اور ترکوں کی وہ کم فہمی اور مخالفت کہ انہوں نے ”بلاوجہ“ احتجاجیوں کے خلاف اعلان جنگ کیا۔ غرض ساری داستان بیان فرمادی۔ یہ صفحات برطانوی تدبیر و سیاست پر مفصل تبصروں کی غرض سے نہیں لکھے جا رہے ہیں۔ ورنہ اس بحث کو میں بھی چھیڑتا کہ ترکوں نے کیوں اعلان جنگ کیا تھا۔ اور گزشتہ دس سال کی خفیہ سازشیں (اور روس کے ساتھ قسطنطنیہ کے متعلق خفیہ معاہدے) کہاں تک اس اعلان جنگ کا باعث ہوئی تھیں۔ اور یہ کہ درجہ عظمیٰ اعلان جنگ کسی طرف سے ہوا تھا۔ (گو وہ باقاعدہ نہ ہو) بہر حال جب وزیراعظم کو سلطان عبدالحمید یاد آئے تو مجھے بھی کسی شاعر کا ایک مصرعہ یاد آیا۔ کہ جب دفن کر چکے تو خطا بھی معاف کی!

خطاوار کی روح کو اس عجیب انداز عفو پر بے اختیار منہسی آتی ہوگی! عبدالحمید خاں مرحوم کی یاد نے انور بے وغیرہ کی شرارتوں کی یاد بھی تازہ کر دی۔ اور وزیراعظم نے ان کی خطاؤں کی فہرست کھولنی شروع کی۔ حتیٰ کہ فرمانے لگے کہ خود ان ترکوں نے جو آئے ہوئے ہیں مجھ سے کہا۔ کہ ہم انور بے کے افعال کو قابل ملامت سمجھتے ہیں! میں اگر جواب دیتا تو یہ دیتا۔ کہ میں بھی اپنے بہت سے ممتاز ہمعوم اصحاب کے بعض افعال کو قابل اعتراض سمجھتا ہوں۔ مگر دوسروں کو اجازت نہیں دے سکتا۔ کہ وہ میرے ان اعتراضات کو میری ہی قوم کے خلاف استعمال کرنے لگیں۔ مگر ہمارے قابل وکیل نے ایک نہایت غیر ذمہ دارانہ بات کہی۔ انہوں نے فرمایا تو یہ فرمایا۔ کہ ”میں بھی

نہیں کہہ سکتا۔ کہ انور پاشا نے اپنی نسل کو (اپنے افعال سے) کوئی فائدہ پہنچایا۔ جب سالہ میں اعلان جنگ ہوا تھا تو میں نے اُسی وقت محسوس کیا تھا۔ کہ یہ ایک غلطی ہے۔ سید حسن امام صاحب نے کیا محسوس کیا تھا۔ اعلان جنگ غلطی تھی یا نہ تھی انور پاشا نے ترکی قوم کو کتنا نقصان پہنچایا۔ ان کے گناہوں کی فہرست کتنی طویل ہے۔ اور اُن گناہوں کے متعلق سید صاحب کی معلومات کس قدر گہری اور وسیع ہیں۔ یہ سب سوالات زیر بحث آسکتے ہیں۔ مگر برطانوی وزیر اعظم کے سامنے ہم اس لئے نہیں گئے تھے۔ کہ ترکوں کی خطا معاف کرائیں۔ اور ان کو بھیک کے چند ٹکڑے دلوائیں۔ ہم مسلمانان ہندوستان کے اُن مطالبات کو پیش کرنے گئے تھے۔ جو سراسر حق و انصاف پر مبنی ہیں۔ حسن امام صاحب کی ذاتی رائے کچھ ہو مگر ان کو کوئی حق حاصل نہ تھا۔ کہ وہ وفد کے متفقہ اصولوں کو تسلیم کرنے کے بعد ہمارے ترجمان بنکر اس ضابطہ کی ملاقات میں اپنے ذاتی خیالات پیش کرتے جن سے اکثر اراکین وفد کو قطعاً اتفاق نہیں ہے۔ یہ غلطی ذاتی طور پر میرے لئے بہت ہی تکلیف دہ تھی۔ اس لئے کہ میں یہ سمجھتا ہوں۔ کہ اُس زمانہ کے حالات جب ترکوں کو مجبوراً اعلان جنگ کرنا پڑا تھا۔ مجھے بھی زیادہ نہیں تو اتنے ضرور معلوم ہیں۔ جتنے سید حسن امام صاحب کے علم میں ہوں گے۔ اگر گنجائش ہوتی تو میں ان صفحات میں انصاف اور آزادی کے ساتھ ان کو بیان کرتا۔ کہ اس وقت جبکہ یورپین تدبیر کی کشاکش میں ترکوں کے لئے دم مارنے کا موقعہ باقی نہ رہا تھا۔ انور بے کی غلطی تھی۔ تو یہ تھی۔ کہ انہوں نے ایک یورپین طاقت پر ضرورت سے زیادہ بھروسہ کیا۔ اور یہ نہ سمجھا۔ کہ جرمنی کو سوائے اپنی اغراض کو مد نظر رکھنے کے کسی چیز کی پروا نہیں اور آخر ہے تو وہ بھی ایک یورپین سلطنت۔ انور پاشا کی

بڑی غلطی یہی تھی۔ کہ انہوں نے جرمنوں کو اپنے ملک کے تمام نظم و نسق پر کسیر حاوی ہو جانے دیا۔ اور اسی کا یہ نتیجہ تھا۔ کہ ترکی فرجین جرمن افواج کی امداد کے لئے دور دراز ممالک میں بھیج دی گئیں۔ اور اپنا ملک خصوصاً عراق عرب وغیرہ خالی رہ گیا! بہر حال یہ بحث ایسی نہ تھی۔ جن پر مسٹر حسن امام کو ہمارے ترجمان کی حیثیت سے اپنی ذاتی رائے ظاہر کرنے کا حق حاصل ہوتا۔

فلسطین کے متعلق وزیر اعظم کا مایوس کن اور خشک جواب اُن لوگوں کے لئے ذرا بھی تعجب انگیز نہ تھا۔ جو جانتے تھے۔ کہ مہینوں پہلے وزیر اعظم یہودیوں کے ممتاز اصحاب سے کیا سمجھوتہ کر چکے تھے۔ فلسطین کا نام آتے ہی وزیر اعظم نے نہایت رد کھا سو کھا منہ بنا کر کہہ دیا کہ یہ مسئلہ تو طے ہو چکا۔ اس کے متعلق اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ گویا فلسطین کے معاملہ میں آبادی و کثرت و قلت یا کمزور و طاقت ور کے حقوق یا حق انتخاب حکومت اور اس قسم کی تمام جدید اصطلاحیں سب بے کار ہیں۔ تازہ ترین سرکاری اعداد و منظر ہیں۔ کہ فلسطین کی آبادی کل ۷ لاکھ ہے۔ جس میں صرف ۱۲۰۰ یہودی ہیں۔ اُس ۱۲۰۰ کی خاطر سارے وہ اصول بھی جن پر دوسرے ممالک کے متعلق بہت زور دیا جاتا ہے۔ درہم برہم کر دیئے گئے۔ اس لئے کہ وزیر اعظم پہلے ہی طے کر چکے تھے۔ کہ فلسطین یہودیوں کا حصہ ہے۔

گفتگو کی یہ ناقابل اطمینان صورت قائم تھی۔ کہ دفعتاً دار العوام سے اطلاع آئی۔ کہ وہاں وزیر اعظم کی ضرورت ہے۔ اور وہ معاً اٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے انہوں نے سید حسن امام صاحب کی تھوڑی سی توصیف فرمائی اور ساتھ ہی وفد کے اراکین پر احسان کا ایک پشوارہ لاد دیا۔ یعنی فرمایا۔ اکثر چیزوں میں محض ہندوستان کی مسلمان رعایا کی اس مداخلت کے باعث ترمیم کی گئی

ہے۔ جو انہوں نے اس قابلا نہ وکالت کے ساتھ کی جسکو میں نے ابھی ابھی سنا ہے۔ اس کے بعد ازراہ عنایت ہر شخص سے ہاتھ ملایا۔ اور مسٹر حسن امام سے دریافت کیا کہ وہ کب ہندوستان جا رہے ہیں۔ جبکہ مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ وکالت ختم ہوگی۔ اور اب آپ کی ضرورت نہ ہوگی۔ تمام اراکین وفد کے لئے یہ اشارہ کافی تھا۔ یعنی وکالت و معروضات کے دروازے بند ہو گئے!!

میں نہیں جانتا۔ کہ دوسرے اراکین وفد کے محسوسات کیا تھے۔ مگر میری نظر میں تو اس ۶ ہزار میل کے دوادوش کا نتیجہ ایک بڑا سادہ صفر تھا! سیدنا صاحب دو تین دن کے بعد ہی ہندوستان روانہ ہو گئے۔ ہم نے چاہا تھا کہ روانگی سے پہلے وہ ان ملاقاتوں کے نتائج پر اپنے خیالات شائع کر دیں۔ لیکن انہی مصلحتوں نے ایسا کرنے کی اجازت نہ دی۔ اور انہوں نے فرمایا کہ انہی راتے میں ہندوستان پہنچ کر خیالات کا شائع کرنا مناسب ہوگا۔ تاہم وزیر ہند کو جو آخری خط وفد کی جانب سے لکھا گیا۔ اس پر سید صاحب نے بھی دستخط فرماتے تھے۔ اور اس خط میں جس کا مسودہ میرے پاس محفوظ ہے۔

تمام اراکین وفد کی جانب سے ان ملاقاتوں کے نتائج پر مایوسی ظاہر کی گئی تھی۔ یہ اُمید بجا نہ تھی۔ کہ جو خیالات اس خط میں لکھے گئے ہیں۔ وہی سید صاحب ہندوستان جا کر ظاہر فرمائیں گے۔ اس وقت یہ خیال نہ تھا۔ کہ ہندوستان کی آب و ہوا میں کیسیں اور ہائیدرجن وغیرہ کے علاوہ ایک اور عنصر بھی شامل ہوتا ہے۔ یعنی مصلحت وقت۔ جب میں اور ڈاکٹر انصاری صاحب ہندوستان واپس آ رہے تھے۔ تو عدن پر کچھ ہندوستانی اخبارات ملے۔ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا۔ کہ سید صاحب نے نہ صرف بمبئی کے جلسہ میں تقریر کرنے سے احتراز فرمایا۔ بلکہ اخبارات کے نمائندوں کو بھی اپنے خیالات بغرض اشاعت

نہ دیتے۔ البتہ ایوشی ایڈیٹر پریس کے نمائندے سے فرمایا تو یہ فرمایا۔ کہ مجھے معلوم ہوا ہے۔ کہ اخبارات میں یہ خبر شایع ہوتی ہے۔ کہ میں نے بمبئی میں یہ کہا۔ کہ برطانوی وزیر اعظم کے مزاج اور طرز عمل سے اس امر کی کوئی اُمید معلوم نہیں ہوتی۔ کہ مسلمانوں کے تمام مطالبات پورے کئے جائیں گے۔ میں نے کوئی ایسی بات نہیں۔ اس لئے کہ وزیر اعظم سے جو گفتگو ہوتی۔ اس میں وزیر اعظم کی جانب سے کسی ایسی کیفیت کا اظہار نہیں ہوا۔ وزیر اعظم نے مسلمانوں کی عرضداشت کو ہمدردی کی نظر سے دیکھا۔ اور اگر وہ ہندوستان مسلمانوں کی اُمید کو پورا نہ کر سکے۔ تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے۔ کہ وہ ایسا کرتا نہ چاہتے تھے۔ بلکہ وہ یہ ہو سکتی ہے۔ کہ وہ مجبور تھے۔ بمبئی میں مجھ سے خواہش کی گئی تھی۔ کہ میں ایک عام جلسہ میں تقریر کروں۔ مگر میں نے ایسا کرنے سے انکار کیا۔ اس لئے کہ میں ابھی تک یہ سمجھتا ہوں۔ کہ وزیر اعظم کے حضور میں مسلمانوں کی عرضداشت ہنوز حیطہ گفت و شنید سے باہر نہیں ہے۔
کیا غنوار نے رسوا لگے آگ اس محبت کو !

میں نے بار بار اس تحریر کو پڑھا اور اپنا سر دھنا۔ بشکل یقین آیا۔ کہ ہمارے توجہ کے سینہ میں ہنوز اُمیدوں کا خزانہ موجود ہے۔ کاشکہ ہمارے دلوں میں بھی وزیر اعظم کی ہمدردیوں کے استقدر خوبصورت نقوش موجود ہوتے یہ تاریخ ۲۶۔ اپریل کو شایع ہوا ہے۔ اور دوسری ملاقات کے بعد ۲۶۔ مارچ کو وہ خط بھیجا گیا ہے۔ جس میں اراکین وفد (بشمول سید صاحب) کی جانب سے ”انتہائی مایوسی“ کا اظہار کیا گیا ہے۔ اور ترتیب وار تمام مطالبات کے متعلق وزیر اعظم کے مایوس کن جوابات کا حوالہ دیا گیا ہے۔ خط کے لہجہ سے صاف مترشح ہوتا ہے۔ کہ چونکہ گفت و شنید کے دروازے بند ہو گئے۔ اس لئے

اراکین وفد انگلستان میں اپنا مزید قیام فضول سمجھتے ہیں۔ ۲۶ مارچ کو سید صاحب نے اس تحریر پر دستخط فرمائے اور تیس دن کے بعد ۲۶ اپریل کو یہ بیان شائع فرمایا۔ کہ ہنوز بہت کچھ اُمید باقی ہے۔ اور وزیر اعظم کی ہمدردیوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں!

میں مانتا ہوں۔ کہ سید صاحب کی قانونی قابلیت اس پایہ کی ہے۔ کہ وہ اپنے دونوں متضاد بیانات کو بالکل صحیح اور یکساں ثابت کر سکیں گے۔ لیکن ایک ناواقف شخص کے دل پر سوائے اس کے کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ کہ سید صاحب وزیر اعظم کے طرز عمل کے متعلق جو کچھ فرماتے ہیں۔ اگر وہ صحیح ہے۔ اگر معاملہ ہنوز ”حیطہ گفت و شنید“ سے باہر نہیں تو پھر اراکین وفد کو لندن میں ٹھہرنا چاہئے تھا۔ اور اس گفتگو کو ختم کر کے واپس آنا چاہئے تھا۔ خود سید حسن امام صاحب کو بھی اپنے پیشہ کے مفاد کی قربانی گوارا کرنی چاہئے تھی۔ خصوصاً جبکہ وزیر ہند سرکاری طور پر ان کے مقدمات کو ملتوی کر دینے کا وعدہ کرتے تھے۔ لیکن اگر سید صاحب کا بیان صحیح ہے۔ تو ہم لوگ گفت و شنید کے دروازوں کو کھلا چھوڑ کر واپس آگئے۔ اس حالت میں یقیناً وفد پر قوم کی طرف سے عدم احساس فرض کا الزام لگایا جاسکتا ہے!

سید حسن امام صاحب وزیر اعظم کی ہمدردیوں کے شیم غنبر بارہندوستان میں جستہدر چاہیں پھیلائیں۔ مگر ملاقاتوں کی سرکاری روئدادیں موجود ہیں۔ وفد کی تحریریں موجود ہیں۔ دونوں میں کہیں دو فقرے ایسے دکھا دیجئے۔ جس سے یہ ترشح ہوتا ہو کہ وزیر اعظم اپنے فیصلوں پر نظر ثانی فرمائیں گے۔ یا وفد کو مزید گفتگو کا موقع دیں گے۔ حقیقت میں اب وہ وقت نہیں ہے۔ کہ محض امیدوں پر بھروسہ کیا جائے۔ سید صاحب کا دل اُمیدوں سے مخمور ہے۔ مگر انہی قوم

کا دل اس روشنی سے محروم ہو گیا ہے۔ اراکین و فداکار فرض ہے۔ کہ وہ اپنے محسوسات کو صفائی کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کر دیں اور جو کچھ گزری ہے اس کو صاف و صریح طور پر بیان کر دیں۔ ہم موجودہ کشمکش میں جو زندگی اور موت کی کشمکش ہے۔ اپنے دلوں کو یاد رہا امیدوں سے متاثر نہ ہونے دیں گے خوشگوار تو ہمارے کتنے ہی خوشگوار ہوں۔ مگر حقیقت نفس الامر کو نہیں بدل سکتے اور وہ یہ ہے کہ جو کچھ حاصل ہوگا۔ اس وقت حاصل ہوگا۔ جب ہم زندگی کی کشمکش میں اپنا وزن ثابت کر دیں اور اپنی حیثیت قائم کر لیں۔

UTION I

کیوں بلاتے گئے تھے؟

UNIVL

ملاقاتیں ختم ہو گئیں۔ بارگاہ وزارت کے دروازے بند ہو گئے۔ بندگان فرماں حاضر ہونے اور رخصت کر دیتے گئے۔ ایک تماشہ تھا۔ کہ ختم ہو گیا۔ کوئی نئی بات ہمارے ذہن میں نہ تھی۔ جو کہتے۔ کوئی نئی بات وزیر اعظم کے پاس نہ تھی جو وہ کہتے۔ ہم نے وہی کہا جو عرصہ سے کہہ رہے ہیں۔ انہوں نے وہی جواب دیا جو وہ دیا کرتے ہیں۔ ہمارے مطالبات بھی وہی تھے انہوں نے انکار بھی وہی تھا۔ ہماری عرض و معروض کا انداز کچھ بدلا ہوا نہ تھا۔ ان کی نفی کا وزن بھی پہلے سے کچھ کم نہ تھا۔ ہمارے آنے سے پہلے کچھ باقی نہ تھا جو وزیر اعظم کے کان تک نہ پہنچا ہو۔ اور ملاقاتیں ختم ہو جانے کے بعد بھی کچھ باقی نہ رہا۔ جو آئندہ کہا جائے غلام بھی وہی تھے۔ آقا بھی وہی تھا۔ ہماری پیشانی بھی وہی تھی۔ اور ان کا سنگ آستان بھی وہی تھا۔ ہماری التجائیں بھی وہی تھیں اور ان کا غماز بھی وہی تھا! پھر آخر یہ سب تھا کیا؟ ہزار میل

کا سفر وہ بھی اس طرح کہ تین دن کے اندر بستر باندھ لیا گیا۔ پھر ہزار میل دہلی
 مہینہ بھر کا قیام۔ وزیر ہند و وزیر اعظم سے ملاقاتیں۔ یہ سب ایک خواب ہے کہ
 چند روز یاد رہے گا۔ میں اس خواب کو حوالہ قلم کرتا ہوں۔ کہ اگر کہیں یہ صفحات
 ہندوستان کے آئندہ مورخ کے ہاتھ پڑ جائیں۔ تو وہ بھی دیکھے۔ کہ ہندوستان
 کس ظلم میں مبتلا تھا! ہر شخص پر چھتا ہے۔ کہ آخر گئے کیوں تھے؟ جواب اس
 کے سوا کیا ہو۔ کہ ”اس لئے کہ بلائے گئے تھے۔“ اتنی جلد کیوں واپس آئے؟ اس لئے
 کہ واپس بھیج دیئے گئے۔ ”کیا پایا؟“ شاعر نے کیا خوب لکھا ہے۔
 ”کہیں کیا اس کے گھر تک کیوں گئے کیوں جا کے پھر آئے۔“
 وہاں کی ٹھوکریں کھانا بدی تھیں کھا کے پھر آئے؟
 چشمِ عبرت نے کچھ دیکھا تو اس تماشے کی سطح کے نیچے برطانوی تدبیر کی
 ایک تصویر کشہ دیکھی۔ بظاہر وزیر اعظم کی یہ بھی ایک ادا تھی کہ بیٹھے بیٹھے کچھ
 خیال آیا۔ اور حکم ہوا۔ کہ ہلا لو۔ بلائے گئے۔ اس معرکہ کو جس صورت سے
 چاہے دیکھتے!

داستان کا یہ حصہ ختم ہوتا ہے۔ دوسری ملاقات کے بعد صرف چار اشخاص
 لندن میں رہ گئے۔ سیٹھ صاحب۔ ڈاکٹر انصاری صاحب۔ شیخ مشیر حسین
 قدوائی صاحب۔ اور میں۔ سیٹھ صاحب علاج کی غرض سے یورپ جانا چاہتے
 تھے۔ اور لندن کے ڈاکٹروں کی ہدایات کے مطابق انہوں نے آسٹریا میں ایک
 مقام پر (کارلسباد) قدرتی چشموں سے علاج کرنے کا نتیجہ کر لیا تھا۔ شیخ قدوائی
 صاحب برسوں سے اپنا زیادہ وقت لندن میں گزارتے ہیں۔ اس لئے وہ بھی
 فی الحال وہیں مقیم رہے۔ میں نے اور ڈاکٹر انصاری صاحب نے یہ طے کر لیا

کہ ہم کو جلد سے جلد روانہ ہو جانا چاہیے۔ ۲۴ مارچ کو وزیر اعظم سے دوسری اور آخری ملاقات ہوئی۔ ۲۶ کو انڈین ایسوسی ایشن نے جو ہندوستانیوں کی ایک انجمن ہے۔ وفد کو چاء کی دعوت دی جس میں وفد کی جانب سے سیٹھ چھوٹانی۔ ڈاکٹر انصاری اور شیخ قدوائی صاحب نے مختصر تقریریں کیں۔ اس عرصہ میں بہت سے ہندوستانی احباب اور اکسفورڈ کیمبرج کے طلباء اصرار کر رہے تھے کہ ڈاکٹر انصاری نان کو اپریشن کے متعلق ایک مفصل تقریر فرمائیں۔ اور جو لوگ ہندوستان کی موجودہ سیاسی تحریکوں کے متعلق ان سے کچھ سوالات کرنا چاہیں ان کو سوالات کرنے کا بھی موقعہ دیا جائے۔ چنانچہ ۵ اپریل کو ایٹیمبرال میں ڈاکٹر صاحب نے ایک مفصل تقریر فرمائی جس کے بعد حاضرین میں سے بعض اصحاب نے نان کو اپریشن کے متعلق مختلف سوالات کئے۔

جس دلچسپی اور شوق کے ساتھ سوالات کئے جاتے تھے۔ ان سے معلوم ہوتا تھا کہ ہندوستان کی نئی نسلیں جو انگلستان میں پرورش پا رہی ہیں اپنے وطن کی سیاسی جدوجہد سے بیخبر نہیں ہیں۔ بلکہ انکے جذبات بھی ہندوستان کے سیاسی لیڈروں کے قدم بقدم چل رہے ہیں۔ بعض طلباء نے تو ڈاکٹر صاحب سے دریافت کیا کہ نان کو اپریشن کے تحت میں انگلستان کے کالجوں کو بھی کیوں نہ بائیکاٹ کیا جائے؟ چونکہ کانگریس کمیٹی نے اس امر کے متعلق کوئی فیصلہ نہ کیا تھا۔ اس لئے ان پر جوش بھائیوں سے یہی کہا گیا کہ جب تک کوئی قطعی فیصلہ نہ ہو اس باب میں رائے دینی مشکل ہے۔ مگر غالباً مہاتما گاندھی ذاتی طور پر اس کو پسند کرتے ہیں۔ کہ جو طلباء اس وقت انگلستان میں ہیں وہ وہاں سے وطن واپس آکر ملکی جدوجہد میں حصہ لیں۔ اس کے بعد ہندوستانی دوست احباب نے ضیافوں کا ایسا سلسلہ شروع کر دیا جس کا ختم کرنا مشکل رہا۔

برائین

میں نے لندن کے سوا انگلستان کا کوئی حصہ نہ دیکھا تھا۔ علاوہ بریں وفد کے گونا گون مشاغل نے مجھے بالکل تھکا دیا تھا۔ اس لئے یہ خیال ہوا۔ کہ روانگی سے پہلے انگلستان کی کوئی دوسری جگہ بھی دیکھ لیں۔ برائین قریب تھا۔ لب سمندر بھی تھا اور برطانوی زندگی کے بہت سے نمونے وہاں دیکھے جاسکتے تھے۔ اس لئے مسٹر شعیب قریشی کے ساتھ میں دو تین دن کے لئے وہاں گیا۔ ساری آبادی دُور تک سمندر کے کنارے پھیلی ہوئی ہے۔ جتنی کہ بازار اور تھیٹر وغیرہ بھی سب لب سمندر ہیں۔ بلکہ سمندر کے اُپر ہیں یعنی ساحل سے دُور تک پانی کے اُپر بہت وسیع پُل بنائے گئے ہیں۔ اور ان پریکڑوں دُکانیں اور بہت سے تھیٹر ہیں۔ شب کو بجلی کی روشنی ان مقامات کو بہت حسین بنا دیتی ہے۔ سمندر کی موجوں کے پہلو میں دو ہی قسم کے انسان نظر آتے۔ یا تو نہایت بوڑھے مرد اور نہایت بوسیدہ عورتیں۔ جو سمندر کی صحت بخش اب و ہوا سے اپنی عمر کے گلے ہونے اور کمزور تار کو کھینچ کھینچ کر بڑھائی کی کوشش کرتے ہیں۔ یا نوجوان مرد اور نوجوان عورتیں کہ ابتدائے عمر کے نشہ میں سرشار ہیں۔ اور سمندر کی موجوں میں جوانی کا ایک نعمہ سنتے ہیں۔ جو آنے والے بڑھاپے کے خطرات سے بالکل بیخبر کر دیتا ہے ! بڑھاپے میں زندہ رہنے کی خواہش بہت قوی ہو جاتی ہے۔ ہزاروں معذوہ واپا ہج دیکھے جو صبح سے شام تک سمندر کے کنارے اپنی اس خواہش کا شہتا دیتے ہیں۔ نوجوان مرد اور لڑکیاں ان کو دیکھ دیکھ کر ہنستی ہیں۔ اور نہیں

جانتیں کہ یہ دن ان کے لئے بھی آنا ہے۔ برائین کی آبادی میں غالباً کثرت اُن لوگوں کی ہے جو ذکر و اناٹ کے تعلقات کی بے اختیاری و بے تحلفی کے لئے برائین کی خاموشی و خلوت کو زیادہ مناسبت سمجھتے ہیں! اور اقدام زندان کے لئے مناسب مواقع بھی کافی پاتے ہیں۔ اس قسم کی کسی پچاس برس تک کی عورت کو نہ دیکھا جسکی آراستگی اسکی دوشیزگی کا دھڑے نہ کرتی ہو۔ اچھے اچھے ہونٹوں میں جہاں "شرفاء" کے سوا کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ شام کے کھانے پر اس قسم کی تجلیاں اُن تجلیوں کے ہنگامے اور آبِ سرخ کی بد مستیاں دو لقمے کھانا مشکل کر دیتی ہیں!

شام کو برائین کی "چوپائی" پر اس عشوہ فروشی کے بازار میں ایک چرنیہ ست عبرت آموز نظر آتی تھی۔ اس انوہ میں سیکڑوں انسانوں کو دیکھتا تھا۔ جو زخم خوردہ اور اپانچ بیماریوں کی کرسیوں پر ادھر سے ادھر ٹھیلے جاتے تھے! کسی کا ہاتھ کٹا ہوا کوئی پا بریدہ۔ کسی کی آنکھیں پھوٹی ہوئی۔ چہرہ بگڑا ہوا۔ ناک کٹی ہوئی۔ کان غائب۔ غرض برائین کے حسن دلاویز کو اُن لوگوں سے وہی نسبت تھی جو طاؤس کے خوب صورت پروں کو اُس کے پاؤں سے ہوتی ہے۔ یہ سب گزشتہ جنگ کے زخمی اور اپانچ تھے۔ یہ زندہ نمونے تھے یورپین تہذیب کے اُن کرشموں کے جنہوں نے سرزمینِ فرانس و بلجیم پر انٹاخون بہایا کہ آج تک خشک نہیں ہوا ہے۔ اور ان مقامات پر جہاں کہیں ذرا سی زمین کھودی جاتی ہے۔ جا ہواخون آج تک ملتا ہے! جس طرح سمندر برائین کے سنگریزوں سے کھیتا ہے۔ قدرت انسانوں سے کھیلتی ہے۔ اپنے مشاغلِ تعیش میں وہ ہزاروں نوجوان جنگ کے خوفناک زمانہ کی ان زندہ یادگاروں کو ایک نظر بھر کر بھی نہیں دیکھتے۔ اور اپنے عیش میں مست ہیں!

براٹین سے واپس آکر مجھے خیال تھا۔ کہ دن بھر کے لئے اکسفرڈ کو بھی دیکھ آؤں گا۔ مگر سفر کی تیاریاں شروع ہو گئی تھیں اور انگلستان سے جی الٹا گیا تھا۔ روانگی کی تیاریوں کے سوا کوئی بات بھلی نہ معلوم ہوتی تھی۔ خدا خدا کر کے ۹۔ اپریل کو صبح کے اسی بجے لندن سے رخصت ہوئے۔ اسٹیشن پر پر اجاب کی جمعیت نے خدا حافظ کہا۔ ہماری ٹرین لندن سے جس قدر دور ہوتی گئی۔ میری روح پر جو پتھر سار کھا ہوا تھا۔ اس کا وزن بھی ہلکا ہوتا گیا۔

عروش البلاد

انگلستان آتے ہوئے ہم نے انگلش چینل میں موسم اچھا پایا تھا۔ حالاں کہ بہت کم ایسا ہوتا ہے۔ کہ ساحل فرانس سے ساحل انگلستان تک آنے میں سمندر کے تلاطم سے دو چار ہونا نہ پڑے گو یہ سفر ایک دو گھنٹہ سے زیادہ کا نہیں۔ لیکن اسٹیمر چھوٹے اور ہلکے ہوتے ہیں۔ علاوہ بریں سمندر ہمیشہ کم و بیش متلاطم رہتا ہے۔ اسٹیمر بہت زیادہ جھکولے کھاتا ہے۔ اور مسافروں کی طبیعت بد مزہ ہو جاتی ہے۔ گو میں کسی سمندر کے سفر میں جہاز کی حرکت اور پانی کے تلاطم سے بد مزہ نہیں ہوتا۔ نہ کبھی متلی ہوتی ہے۔ نہ قے آتی ہے۔ مگر واپسی کے وقت انگلستان کے ساحل سے فرانس کے ساحل تک پہنچنا دو بھر ہو گیا۔ سمندر کی موجیں اسٹیمر کے بالائی عرشہ تک آتی تھیں اور اسٹیمر کا یہ حال تھا۔ کہ جری طرح بھکولے کھا رہا تھا۔ دوپہر کا کھانا حلق سے اتارنا مشکل ہو گیا۔ رکابیاں میز پر ٹھہرنے سے قطعاً انکار کرتی تھیں۔ اور میں نے تو سمندر کا ایک طمانچہ ایسا کھایا۔ کہ عمر بھر یاد رہے گا۔ ہم اپنے چھوٹے بیگ اور کبیل

وغیرہ اُوپر عرشہ پر چھوڑ آئے تھے۔ میں کھانا کھانے کے بعد اس خیال سے اُوپر گیا۔ کہ اپنا چھوٹا بیگ اُٹھا لاؤں اور ذرا سمندر کے تلاطم کا لطف بھی دیکھوں مگر عرشہ پر پہلا ہی قدم رکھا تھا۔ کہ ایک موج زور سے آکر ٹکرائی میں وہیں گر گیا اور اگر وہ چار قدم اور آگے بڑھا ہوتا تو تعجب نہ تھا کہ وہ موج مجھے کھینچ کر سمندر میں لے جاتی۔ اس صورت میں دنیا کی آبادی تو کچھ کم نہ ہوتی مگر یہ اوراق شروع سے آخر تک سادہ رہ جاتے! بہر حال جہاز کے ملازمین نے سنبھالا سارے کپڑے شرابور ہو گئے اور اُس چڑیا کی طرح جس کو کنویں سے کالایا گیا ہو ہم نیچے آکر آتش دان کے پاس سوکھنے لگے! ولے بخیر گردش جہاز کے اندر ہر طرف لوگوں کا یہ بُرا حال تھا۔ کہ اس کو دیکھ کر طبیعت بدمزہ ہوتی ہے۔ ہر طرف لوگ اگال دانوں میں مُنہ ڈالے پڑے ہوئے تھے۔ اور کھانے کا کمرہ بُری بُری آوازوں سے گونج رہا تھا۔ تاہم میں نے دوپہر کا کھانا پیٹ بھر کر کھایا! اگال دانوں والے دیکھ دیکھ کر رشک کرتے ہوں گے۔ شام کو بجے پیرس کے اسٹیشن پر پہنچے جہاں اپنے دوست موسیو والد ام کو موجود پایا۔ سیدے ہوٹل گئے۔ اور ترک اجاب کو اپنے ویاں پہنچنے کی اطلاعیں دیں +

ہم نے اپنے پروگرام میں ایک ہفتہ پیرس کے لئے رکھا تھا۔ ڈاکٹر نہاد ارشاد خلیل خالد بے۔ ڈاکٹر بھجت بے اور بعض دوسرے اجاب سے مفصل ملاقاتیں ہوئیں۔ خلیل خالد بے تو اسی ہوٹل میں تھے جس میں ہم مقیم تھے۔ اس لئے دن میں کئی کئی دفعہ ملاقات ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نہاد ارشاد دوسرے تیسرے دن ملتے رہے۔ ڈاکٹر بھجت بے تقریباً روزانہ تشریف لاتے تھے۔ رہے موسیو والد ام وہ تو اس طرح ہمارے ساتھ تھے۔ کہ گویا ہم ان ہی کے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں۔ پیرس میں جو کچھ قومی کام کیا۔ اور جو کچھ سیر

کی وہ سب موسیٰ و الدام کی بدولت۔ اُن جیسے سچے کام کرنے والے سوچا پس ہیں نصیب ہوں تو ہندوستان کی کوششوں کے چار چاند لگ جائیں۔ سچے۔ سادہ۔ بے لوث۔ محبت کرنے والے۔ بہت کم نصیب ہوتے ہیں۔ بیچارے اپنے تمام کاموں کو چھوڑ کر ہر وقت ہمارے ساتھ تھے۔ اور ہم بھی انکی محبت سے کافی نا جائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ ڈاکٹر بھت و وہی ڈاکٹر انصاری صاحب کے پرانے دوستوں میں ہیں اور اس میں شک نہیں کہ بڑے ہی دلفریب آدمی ہیں۔ دو دن ڈاکٹر صاحب کو بخار آیا تو ان بیچارے کی یہ حالت تھی کہ رات کو ایک ایک بجے تک ڈاکٹر صاحب کے بستر کے قریب بیٹھے رہے۔ اور مجھے تو انہوں نے تیمارداری کا موقع ہی نہ دیا۔

ترکوں کی جدوجہد کے متعلق بہت سی معلومات ہم نے ان احباب سے حاصل کی۔ اور ان کو ہندوستان کے اصلی حالات بتائیے۔ وہ سب ہی ہمارے اس خیال کو بہت پسند کرتے تھے۔ کہ پیرس میں ہندوستان کی جدوجہد کے متعلق تبلیغ و اشاعت کے لئے ایک کمیٹی بنائی جائے جو تمام اسلامی مسائل کو مد نظر رکھ کر فرانس میں کام کرے۔ میراثو اب بھی یہ خیال ہے کہ انگلستان سے زیادہ پیرس و روما میں خلافت کمیٹی کے نمائندوں کا موجود رہنا ضروری ہے۔ دوسرے سفر یورپ نے اس خیال کو زیادہ قوی کر دیا ہے۔ خصوصاً اس لئے کہ میں خوب دیکھ کر آ رہا ہوں کہ اب تک خلافت کمیٹی نے پیرس میں جو روپیہ تبلیغ و اشاعت میں خرچ کیا۔ وہ تقریباً ضائع کیا گیا ہے اس باب میں بڑی شکایت مہاتما جی سے ہے۔ جنہوں نے ہمیشہ غیر ملکیوں میں تبلیغ کے کام کو روکا اور کبھی پسند نہ کیا۔ اُن جیسا عالی دماغ شخص اس حقیقت سے تو بخیر نہ ہوگا۔ کہ اب ہندوستان دور دراز سمندر کا کوئی غیر آباد جزیرہ نہیں ہے۔

جس کے انسان ہنوز عہد وسطیٰ کی تاریکی میں جانوروں کی کھالوں اور درختوں کے پتوں سے ستر پوشی کرتے ہوں۔ بہر حال ان صفحات میں اس بحث کا لانا ضرور نہیں۔ ورنہ اس باب میں میرے ناچیز خیال بہت وسعت چاہتے ہیں۔

پیرس میں ایک ہفتہ اس طرح گزرا۔ کہ گزرتا ہوا معلوم بھی نہ ہوا۔ لندن کے بعد یہ ۳۰ لاکھ کی آبادی اور اُسی کی نسبت سے شہر کی عمارتیں اور بازاروں کی چہل پہل ہمارے لئے کوئی بڑی عجیب بات نہ تھی۔ تاہم برطانوی دارا کی تاریکی اور سردی سے نکل کر پیرس کی آب و ہوا بیدار ہو گیا معلوم ہوئی۔

یالندن کی سربلک عمارتیں ہیں۔ یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی ابھی شاہراہ پر چلنے والوں کو چاروں طرف سے گھیر کر کچل دیں گی یا پیرس کے خوب صورت بازار اور محلے ہیں۔ کہ وہ اتنے کشادہ نہ بھی ہوں۔ مگر صاف اور ستھرے ہیں۔ اس "جنت نگاہ" میں ہر قدم پر برطانوی اور فرانسیسی قوموں کا فرق صاف نظر آتا تھا۔ نہ صرف عمارتیں اور شہر کی دلچسپیاں۔ بلکہ فرانسیسی اخلاق بھی ایک بالکل دوسری چیز ہے۔ مجھے تو یہ محسوس ہوا۔ کہ اگر یورپ میں کوئی قوم ہے۔ جو لحاظ فطری مذاق کے اشیاء سے کچھ ربط رکھ سکتی ہے۔ تو وہ فرانسیسی قوم ہے۔ تصنع نہیں ہے۔ معائب و محاسن دونوں صاف نظر آتے ہیں۔ جیہوں پر اس غرض سے ملمع نہیں کیا جاتا۔ کہ وہ ہنر معلوم ہوں۔ سچائی اور خوش اخلاقی بے لاگ ہے۔ اور اسی طرح گناہ بھی عریاں ہے، ہر عیب و صواب سب بے پردہ ہے۔ بڑا کشتہ یا اچھا۔ شاید یورپ کی تمام دوسری اقوام اس خصوصیت سے محروم ہیں۔ شام کو بلوار پر چہل قدمی کیجئے۔ یا تولیہ بڑکا نظارہ دیکھئے۔ یا شب کو کسی آدھرائیں یا فائیز میں جا بیٹے۔ وہی بے تکلفی اور رسم و راہ کی آزادی نظر آئیگی۔ جو معصیت سے تو پاک نہیں۔ مگر مکر سے پاک ہے، ہموار

(جو بجائے خود ایک محلہ ہے) میں تھوڑا دقت گزار بیٹہ تو انسانیت کے عجیب عجیب نمونے نظر آئیں۔ یہ مقام رسم و رواج کی آزادیوں کا ایک حیرت انگیز نمونہ ہے۔ ایک ایشیائیزاد جب سورج کی روشنی میں مردوں اور عورتوں کی بے تعلقوں کو سر راہ دیکھتا ہے۔ تو ایک سرسری نظر کے بعد اس کا دل اس سے پوچھتا ہے۔ کہ اگر بد اخلاقیوں اور عیش پرستیاں قوموں کی تباہی کا بڑا سبب ہوتی ہیں۔ تو پھر یورپ کیوں زندہ ہے؟ معلوم نہیں ہمارے ہندوستان کے علمائے کرام (جو مسلم لیگ کے اجلاس میں ایک عورت کو تقریر کرتے دیکھ کر بہت بے لطف ہو گئے تھے) ان مناظر کو دیکھ کر کیا کہیں؟ پیر کس میں دو ہی قسم کے لوگ زندہ رہ سکتے ہیں یا تو وہ جو ان چیزوں کے عجیب صواب پر غور کرنے کی حدود سے آگے نکل گئے ہوں۔ یا وہ جو فلسفیانہ نظر سے ان تماشوں کو دیکھ سکیں! تھیٹروں اور ناچ گھروں میں جانے کی زحمت کیوں گوارا کیجے۔ شب کو سر راہ رقص کی محفلیں جھی ہوتی ہیں۔ ایک دو نہیں سارے شہر میں سینکڑوں۔ ان میں رقصہ کا ہلکا ریشم کا لباس بھی اس کے جسم صندلیں سے بغاوت کرتا ہے۔ اور پھر گویا ملک کا کوئی قانون نہیں جو حاکم ان بیٹیوں پر عاید ہو سکے! لباس کا ہر تکرار سوئی کے ٹانگوں سے جھگڑا کرتا ہے۔ موزوں کی باہیگی آدھم کی رنگت میں تیز کرنا ممکن نہیں۔ لباس کی تیاری میں اگر کفایت شعاری یوں ہی بڑھتی رہی تو عجب نہیں۔ کہ یورپ کی صنف نازک پھر ایک دفعہ فطرت کے اس لباس سے آراستہ نظر آئے۔ جس کا نہیں سیدھا لٹا۔

آج تک ہندوستان میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ترکوں کی بد اخلاقی کو ان کی تباہی کا باعث بتاتے ہیں۔ شاید سچ ہو۔ مگر کسی ذالیسی کے سامنے

ایسا نہ کہتے گا! مفلس ہندوستانیوں کے طبایع کیونکر ان گرم بازاروں سے مانوس ہو سکیں۔ میرا تو یہ حال تھا۔ کہ تخیل دو چیزوں میں الجھا ہوا تھا۔ دن میں شہر کے اکثر مقامات دیکھتا تھا۔ جہاں گزشتہ جنگ کے خوفناک نقش و نگار ابھی تک موجود ہیں۔ گولوں کے گرنے کے نشان ٹوٹی ہوئی عمارتیں گری ہوئی دیواریں۔ میرا ہنسا ہر چیز کو ٹھہر ٹھہر کر دکھاتا تھا۔ یہ کب ہوا کیسے ہوا۔ جب جرمینوں کا گولہ گرا تو اس محلہ کا کیا حال تھا؟ کتنے آدمی مارے گئے تھے۔ کتنے زخمی ہوئے تھے۔ غرض ساری تفصیل بتاتا تھا۔ مگر شام کو بازاروں میں اور لب سڑک رقص و سرود کے ہنگامے کچھ ایسے ہوتے تھے۔ کہ گویا اس شہر پر کبھی کوئی مصیبت ہی نہ آئی تھی۔ ہر شخص کا ایک قدم (کم از کم) بالکل بہشت کی چوکھٹ پر۔ اور دوسرا قدم دنیا میں! یہ عالم میرے لئے ایک معجزہ تھا! انسان کس قدر جلد مصیبتوں کو بھولتا ہے۔ اور ہمارے ایشیا میں جس چیز کو عبرت کہتے ہیں۔ وہ کیا ہے۔ کچھ ہے یا محض ڈھکوسلہ ہے! اس ہنگامہ عیش میں سارا پیرس اور فرانس کی شہری آبادی غرق ہے! گو کہ فرانسیسی قوم کا شمار جنگجو اقوام میں نہیں ہے۔ تاہم قومی شجاعت کے نشانات ہم کو ہر جگہ نظر آتے۔ پنولین کا نام تو پیرس کے درو دیوار پر پر موجود ہے۔ کہیں کوئی کتبہ لگا ہوا ہے۔ کہیں پنولین کے نام کا فوارہ نصب ہے۔ کہیں بڑے بڑے مینار اور دروازے بنائے گئے ہیں۔ جن پر پنولین کی فتوحات کے مختلف مرقعے نقش ہیں۔ خود پنولین کا بنایا ہوا مینار واندوم کا اپنی قسم کی ایک ہی چیز ہے۔ کہا جاتا ہے۔ کہ پنولین نے ۱۲ سو توپوں کو جو وہ دشمن سے چھین کر لایا تھا۔ گلایا اور اس کے لوسے سے یہ ۱۲۲ فٹ اونچا مینار بنایا گیا۔ جس کے اوپر خود پنولین کا ایک مجسمہ نصب ہے۔ ایک

فوارہ "فائٹین دی لادکٹور" بھی فرانسیسی صنایعی اور اس سے زیادہ فرانسیسی
تخیل کا ایک اچھا نمونہ ہے۔ اس کو نپولین اول نے اپنی فتوحات کی یادگار
کے طور پر بنایا تھا۔ فوارہ کی وضع یہ ہے۔ کہ چار مجسموں پر فوارہ کا طشت رکھا
ہوا ہے۔ ہر مجسمہ حکومت کی ایک خاص صفت کا مظہر ہے۔ ایک وفاداری کی
تصویر ہے۔ دوسرا "باخبری" کا مرقع ہے۔ تیسرا انصاف کا بت ہے۔ چوتھا
طاقت کا دیوتا ہے۔ ان سب سے اوپر "فتح" کا ایک انسانی تخیل مجسمہ کی صورت
میں نصب ہے۔ ۱۹۱۷ء کے بعد اب اگر تہذیب جدید کی یادگار قائم کرنی
ہو تو اس فوارہ کو پانچ مجسموں کی ضرورت نہیں۔ صرف دو کافی ہیں۔ نیچے طاقت
کا دیوتا اور اوپر فتح کا ایک پیالہ۔ جس سے خون کا فوارہ چل رہا ہو!

ایک دوسرا مینار پلاس دی لا کوئٹار دین دیکھا جو عہد انقلاب کی یادگار
ہے۔ یعنی جس جگہ وہ مینار بنایا گیا ہے۔ وہاں انقلاب کے زمانہ میں گردن
کاٹنے کی مشین لگی ہوئی تھی جس پر انقلاب پسندوں نے سب سے پہلے خود
اپنے بادشاہ کی گردن رکھی تھی! آج فرانس کے حالات دیکھ کر یقین نہیں آتا۔
کہ یہی وہ قوم ہے۔ جس نے آزادی کے لئے خون کے دریا بہائے تھے۔

اور اپنی قوم کے بڑے بڑے لوگوں کو گتوں کی طرح مارا تھا۔ یا یہی وہ
قوم ہے جو کل فلاندرس کے میدان میں اپنی ایک جوان نسل کو کلیتہاً نابود
کر چکی ہے۔ یہ جو عورتیں سڑکوں پر ناچتی ہیں۔ یہ وہی ہیں۔ جو کل فرانسیسی
سپاہیوں کے زخم دھو رہی تھیں؟ یہ جو مرد شراب کی صراحیوں ہاتھوں
میں لئے ہوئے مستانہ وار جھوم رہے ہیں۔ یہ وہی ہیں جو کمر کس کر میدان
جنگ میں گئے تھے۔ اور فرانس کے تمام اتحادیوں سے زیادہ خون بہا کر آئے تھے؟
کیسی عجیب جنگجوئی ہے۔ میدان جنگ کے سورما پیرس کی گلیوں میں اداے

ناز کے مقتول ہیں! فطرت انسانی کے اس معمہ کو کوئی سمجھا ہو تو مجھے سمجھا دے گا
جب میں نپولین کے مقبرہ میں کھڑا ہوا اسکی عالمگیر عظمت کی داستانیں دل
میں دھرا رہا تھا۔ تو بار بار میرا تخیل اس معمہ سے دست و گریبان ہوتا تھا۔
کہ جس قوم کے آغوش میں نپولین جیسا سپاہی۔ والتیر اور روسو جیسے فلسفی
اور حکما اور ہیرو گوارڈولا جیسے اہل قلم پرورش پائیں۔ اس کے مشاغل زندگی
میں جزو غالب تعیش کی بے اختیاریاں اور رنگینیاں ہوں۔ *

پیرس کے نواح میں وارسامی (Versailles) ایک مشہور مقام ہے
جسکی گزشتہ تاریخ نے مجھے بھی دعوت نظارہ دی۔ پیرس سے وہاں تک
موٹر میں گیا۔ بلحاظ قدرتی خوب صورتی شادابی اور سبزہ کے میں نے سویٹزرلینڈ
کے سوا اور کہیں اس قدر خوب صورت سڑک نہیں دیکھی۔ میلوں تک یہ معلوم
ہوتا تھا۔ کہ ایک سرسبز باغ ہے۔ جو پھولوں سے لدا ہوا ہے۔ وارسامی کی
تاریخی عظمت کا سب سے بڑا سبب (میری نظر میں) یہ ہے۔ کہ اُسی کے
رقبہ میں سب سے پہلے انقلاب فرانس کا شعلہ بلند ہوا تھا۔ اور وہ تلواریں
سب سے پہلے وہیں بے نیام ہوئی تھیں جنہوں نے استبداد کے زہریلے
درخت کو سر زمین فرانس سے کاٹ کر پھینک دیا۔ اس وقت سب سے زیادہ
قابل دید شاہی محل سمجھا جاتا ہے۔ جس کو انقلاب کے بعد کوئی ایسا مکین میسر
نہ آیا۔ جس کے سر پر تاج ہوتا۔ اور اب تو سوائے ایک دو بوڑھے درباروں
کے جو آنے جانے والوں کو عمارت کی سیر کرا دیتے ہیں۔ اور اس بہانہ سے
انکی روٹیاں چلتی ہیں۔ اُس شاہی محل کے در و دیوار خاموش ہیں۔ جسکی تعمیر
وآرایش میں ۵۰ کروڑ روپیہ صرف ہوا تھا۔ ایک قبرستان ہے جسکی ایک ایک
اینٹ میں فرانسیسی تاجداروں کی بلند اقبالی دفن ہے!

محل کے اکثر کمرے اسی حالت میں رکھے گئے ہیں۔ جو حالت کہ شاہ
 لوئی چہار دہم کے زمانے میں تھی۔ اس عہد کا مورخ کہتا ہے کہ دار سائی کا
 محل حسن و رعنائی کا ایک نگار خانہ تھا۔ اور آج بھی بہت سے ایسے نقوش
 وہاں نظر آتے ہیں۔ تصویریں۔ قالین۔ Tapestry اور بہت سی ایسی
 چیزیں اپنے گزرے ہوئے مالکوں کی قدر دانی کی یادگار موجود ہیں۔ عمارت
 کے ایک حصہ میں تقریباً تمام شاہانِ فرانس کی تصاویر آویزاں ہیں۔ لوہے
 اور پتھر کے مجسموں سے سارا پائیں باغ پُر ہے۔ دس دس قدم پر فرانسیسی
 ساز کی صنعت کے بہترین نمونے نصب ہیں۔ یونان و روم کے تمام دیوتاؤں
 کے مجسمے صناعوں کے تخیل کے بہترین نمونے۔ بلا مبالغہ تعداد میں اتنے ہی
 ہیں۔ جتنے کہ اُس باغ میں درخت ہیں! مگر وہ سب مصور کی صنعت اور
 انسانی حسن کا ایک دیران خانہ ہے۔ جس کے در و دیوار نے شاہانِ فرانس
 کی عیش پرستیوں کے کیسے کیسے ہنگامے دیکھے ہوں گے۔ ہم ہندوستان
 میں ایک جان عالم و اجد علی شاہ اور محمد شاہ پیا کی بزم آرائیوں پر انگلیاں
 اٹھاتے ہیں۔ وہاں کتنے ہی جان عالم اور پیا گزر گئے ہیں۔ اور آج ہر شخص
 بجائے خود ”جان عالم“ اور ”پیا“ ہے۔ شاید فرانس کی سیاسی آزادیوں کا یہ بھی
 ایک اقتضا تھا۔ کہ جب بادشاہوں کی استبدادیت کا قلع قمع کیا گیا۔ تو
 ان کے حقوق شاہانہ جس میں تعیش بھی شامل ہے۔ اُن سے چھین کر عامۃ الناس
 کے اندر بدرجہ مساوی تقسیم کر دئے گئے۔ تاکہ اس جمہوریت میں ہر شخص بادشاہ
 جب ۱۸۷۰ء میں جرمنی اور فرانس کی لڑائی ہوئی تھی۔ اور جرمن فوج
 نے پیرس کا محاصرہ کر لیا تھا۔ تو اسی محل میں جرمن شاہزادے اور افسر
 مقیم تھے۔ یہ واقعہ بھی عبرت آموز ہے۔ کہ تیس برس پہلے جس محل میں

جرمن افسروں نے فاتح کی حیثیت سے قیام کیا تھا۔ اسی محل میں گزشتہ جنگ یورپ کے بعد ۱۹۱۹ء میں جرمنوں نے مغلوب ہونے پر صلح نامہ پر دستخط کئے، وہ میز بھی دیکھی جس پر یہ صلح نامہ رکھا گیا تھا۔ اور وہ قلم بھی موجود ہیں۔ جس سے دول کے نمائندوں نے دستخط کئے تھے! وہی ایک محل ہے۔ جس میں فاتح بھی آئے اور مفتوح بھی۔ جو کل غالب تھا۔ آج مغلوب ہو کر آیا۔ اور معلوم نہیں کل پھر کیا ہونا ہے! اینٹ اور پتھر کی یہ دیواریں کیا کیا تماشے دکھیتی ہیں!

وارسائی کی سیر بحیثیت مجموعی بہت دلچسپ تھی۔ چند گھنٹہ ٹھہر کر میں پرین چلا آیا۔ اس عرصے میں ترک احباب کے علاوہ بعض فرانسیسی اصحاب سے بھی سیاسی معاملات پر گفتگو ہوتی رہی۔ جس کا خلاصہ یہ ہے۔ کہ ہم نے اہل فرانس کو اور فرانس کے سیاسی حلقوں کے ممتاز اصحاب کو بھی ترکوں کا ہمدرد پایا۔ لیکن وہ سب مجبور ہیں۔ کوئی عملی امداد نہیں دے سکتے۔ برطانیہ کے اتحاد نے ان کو بے دست و پا کر دیا ہے اور اس اتحاد سے زیادہ جرمنوں کا خوف جو اہل فرانس کے دل میں جاگزیں ہے۔ باوجودیکہ جرمنی کو شکست ہو چکی۔ فرانس نے جی بھر کر گزشتہ جنگ کا انتقام بھی لے لیا۔ اور لے رہا ہے۔ لیکن بچوں کی طرح جو خوف جی میں بیٹھ گیا ہے۔ وہ موجود ہے۔ وہ سمجھتے ہیں (اور یہ شاید ایک حد تک غلط نہ ہو) کہ دس برس کے بعد جرمنی کی طاقت پھر وہی ہوگی جو تھی اور پھر وہ فرانس پر حملہ کرے گا۔ پس وہ کہتے ہیں۔ کہ اگر ہم برطانیہ سے بگاڑ لیں تو ہمارے لئے نجات کی کوئی صورت نہیں! برطانیہ بھی ان کے اس خوف سے کافی فائدہ اٹھا رہا ہے۔ اور جب فرانس کے تیور بدلتے دیکھتا ہے۔ فوراً جرمنوں کے ساتھ آشتی کا اظہار شروع

کہ دیتا ہے! اس موقع پر ایک دلچسپ واقعہ یاد آیا۔ جس سے ظاہر ہوتا ہے۔
 کہ اہل فرانس کے دلوں میں جرمنوں سے کس قدر نفرت اور ان کا کس درجہ
 خوف جاگزیں ہے۔ میں روما سے تیس جا رہا تھا۔ میرے درجہ میں ایک
 فرانسیسی عورت اور اسکی بیچ سالہ لڑکی بھی تھی۔ راستہ میں کسی اسٹیشن پر ایک
 بوڑھا مرد اور ایک بوڑھی عورت بھی آکر بیٹھے۔ وہ فرانسیسی لڑکی میرے اور اس
 بوڑھے کے درمیان بیٹھی ہوئی تھی۔ اور اسکی ماں اس کے سامنے کی نشست پر
 تھی۔ تھوڑی دیر تو وہ دونوں آنے والے خاموش رہے۔ اس کے بعد انہوں
 نے آپس میں گفتگو شروع کی۔ تو جرمن زبان میں میں اس وقت سمجھا۔ کہ وہ
 دونوں جرمن ہیں۔ اور غالباً یہی خیال اُس فرانسیسی خاتون کو پیدا ہوا۔ وہ
 حرکت دیکھنے کے قابل تھی۔ کہ جیسے ہی فرانسیسی خاتون کو یہ محسوس ہوا۔ کہ
 وہ دونوں جرمن ہیں۔ اُس نے فوراً اٹھ کر اپنی لڑکی کو وہاں سے اٹھا کر اپنی
 گود میں بٹھالیا۔ جس طرح مرغی خطرہ کو محسوس کر کے اپنے بچوں کو پروں میں
 چھپالیتی ہے! یہ حرکت اس قدر بے ساختہ تھی۔ کہ میں حیران رہ گیا۔ اس سے
 زیادہ نفرت کا اظہار اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ اپنے بچے کو ایک جرمن کے پاس
 بٹھانا بھی گوارا نہ ہوا! حقیقت یہ ہے۔ کہ میں نے ایسی سخت نفرت کسی ایک
 قوم کو دوسری قوم سے نہیں دیکھی۔ جیسی فرانسیسیوں کو جرمنوں سے ہے۔
 یہی وجہ ہے۔ کہ فرانس کسی معاملہ میں برطانیہ سے اختلاف نہیں کر سکتا۔
 اور ڈرتا ہے۔ کہ برطانیہ جرمنی کی باگیں ڈھیلی نہ کر دے۔ چنانچہ بعض فرانسیسیوں
 نے ہم سے یہ صورت حال صاف الفاظ میں بیان کی۔ جیسا کہ میں کہہ چکا
 ہوں۔ فرانسیسیوں میں عام طور پر تصنع اور مکر بہت کم ہے۔ (گو مکر و تصنع
 کی مثالیں خصوصاً سیاسیات میں ناپید نہیں ہیں۔ آخر وہ بھی تو یورپ

ہی میں رہتے ہیں!) اسی لئے وہ اپنی حالت کو چھپاتے نہیں۔ اخلاقی طور پر ہمیں کوئی فرانسیسی ایسا نہیں ملا۔ جس نے ترکوں کے حقوق کا اعتراف نہ کیا ہو۔ اور جو نا انصافیاں ان کے ساتھ کی گئی ہیں۔ اور کی جا رہی ہیں۔ ان کو جڑا نہ کہا ہو۔ تاہم ممکن ہے۔ کہ کسی وقت فرانسیسیوں کے ان منصفانہ خیالات سے ترکوں کو کوئی فائدہ پہنچ سکے۔ گواہ تک نہیں پہنچا ہے۔ وزیر کی کانفرنس میں حقیقت بھی واضح ہو گئی۔ کہ ترکوں کے ساتھ فرانس کا ادھار دوستی عام سیاسی مصلح کا ماتحت ہے۔ اور یہ کہ جب مخالفت میں فائدہ کی کوئی صورت نظر آئے فرانس ترکوں کا ساتھ چھوڑنے کے لئے تیار ہے۔ جب کانفرنس کے موقع پر فرانس کو یہ اُمید ہوئی۔ کہ انگلستان جرمنی کے متعلق اس کے طرز عمل پر نکتہ چینی نہ کرے گا۔ فوراً ہی وہ ترکوں کی اخلاقی اعانت سے بھی دستکش ہو گیا۔ اور یہ امر واقعہ ہے۔ کہ فرانس نے وقتاً باوجود وعدوں کے کانفرنس میں ترکوں کا ساتھ چھوڑ دیا۔ نومبر ۱۹۱۸ء میں ۱۲ دن کے لئے وزیرین گیا تھا۔ جبکہ وہاں کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ دوران قیام میں خود ہزیکینلسی عصمت پاشا اور دیگر اراکین وفد انگور کی مفصل ملاقاتیں ہوئیں۔ اور جو حالات وہاں جا کر معلوم ہوئے۔ ان کی تفصیل بیان کرنے کے لئے ایک ضخیم کتاب کے اوراق کی ضرورت ہے۔ خلاصہ یہ ہے۔ کہ جو کچھ میں نے اپنے دوسرے سفر یورپ کے سلسلہ میں وزیرین جا کر دیکھا۔ اس کا عشرہ عشر بھی مسلمانان ہند کے پیش نظر نہیں۔ وہ ایک نئی دُنیا ہے۔ اور ایک نئی زندگی ہے۔ جو ترکی وفد کے اراکین کے اندر نظر آئی۔

محو حیرت ہوں کہ دُنیا کیا ہے کیا ہو جاگی!

غازی مصطفیٰ کمال کے نمائندے پیرس میں معتد بہ کام کر رہے ہیں۔ اور ڈاکٹر رشا وغیرہ نے سیاسی حلقوں میں اچھا اثر پیدا کر لیا ہے۔
 فرانس میں سب سے بڑی آسانی یہ ہے۔ کہ ہر شخص آزادی کے ساتھ اپنا خیال بیان کر سکتا ہے۔ اور پیرس سے بیٹھ کر تمام یورپ میں مطالبہ حق و انصاف کی آواز پہنچ سکتی ہے۔ اسی لئے میں اس تجوز کو ضروری سمجھتا ہوں کہ مسلمانان ہند کا ایک نمائندہ بھی وہاں رہا کرے۔ اور وہاں رہ کر اس ملک کے خیالات کی اشاعت و تبلیغ کر سکے۔ یہ کام جس آسانی سے پیرس میں ہو سکتا ہے۔ شاید کسی ملک میں نہیں ہو سکتا۔

غرض کہ پیرس اور پیرس والوں کو خوب دیکھا۔ اور حسرت رہی کہ کچھ نہ دیکھا سب سے زیادہ افسوس مجھے عجائب خانہ اور کتب خانہ کے نہ دیکھ سکے کا ہے۔ عجائب خانہ دُنیا کے بہترین مصوروں کے صنایعوں کا گنجینہ ہے۔ اور کتب خانہ کی نسبت کہا جاتا ہے۔ کہ غالباً دُنیا میں سب سے بڑا کتب خانہ ہے۔ ۳۵ لاکھ کتا ہیں ڈیڑھ دو لاکھ قلمی نسخے۔ ۳ لاکھ کے قریب نقشے اور اس کے علاوہ بہت

لے دوسرے سفر میں جب ۷ ماہ تک خاص پیرس میں مقیم رہا یہ مقامات بھی خوب دیکھے۔ عجائب خانہ لوور واقعی عجائب خانہ ہے۔ وہ صنایعی اور مصوری کا ایک عجیب و غریب خزانہ ہے۔ اور اس کے ذخائر کی وسعت کا یہ عالم ہے۔ کہ میں ۷ ماہ میں کم و بیش دس دفعہ وہاں گیا۔ اور ہر دفعہ پورا دن صرف کیا۔ لیکن شاید نصف سے زیادہ نہ دیکھ سکا۔ حال ہی میں اس عجائب خانہ میں ایک مشرقی سینہ بھی لہو لا گیا ہے۔ اُس کے اندر مشرقی ممالک کی صنایعوں کے بہت سے نمونے موجود ہیں۔ لیکن ہر قدم پر یہ محسوس ہوتا ہے۔ کہ مغرب مشرق کو نہیں سمجھتا۔ نہیں جاننے۔ نہیں سمجھ سکتا۔ اور نہیں جان سکتا۔ اس کی تفصیل کسی دوسرے موقع پر عرض کر دوں گا۔

کچھ یہ گراں بہا علمی خزانہ اہل ذوق کی جنت ہے۔ اور ہندوستان کے مسلمانوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کتب خانہ میں اسلامی کتب کا ایک بڑا ذخیرہ ہے بہت سے ایسے قلمی نسخے ہیں جن کا نام اہل علم سنتے ہیں۔ مگر ایک پرزہ کہیں نہیں مل سکتا۔ یورپ کے اہل قلم ان نسخوں سے استفادہ حاصل کرتے ہیں اور ہندوستان کے عربی درسگاہوں میں جہاں بڑے بڑے اہل علم جمع ہیں خبر ہی نہیں۔ کہ پیرس میں کوئی ایسا کتب خانہ بھی ہے۔ جہاں قلمی اوراق میں اسلام کی بہترین مصنفین و حکما کی دماغ سوزیاں اب تک محفوظ ہیں۔ ہندوستان کے سب سے بڑے مدرسہ کا کتب خانہ ایک دفعہ دیکھا تھا۔ اس کا مایہ ناز ایک الماری تھی جس میں مصر کی مطبوعہ کتابیں رکھی ہوئی تھیں۔ اور باقی درسی کتابوں کا ڈھیر تھا۔ بس۔ میں نے چاہا تھا۔ کہ پیرس کے کتب خانے میں جو قلمی نسخے عربی یا فارسی کے ہیں۔ ان کی ایک فہرست مل جائے۔ مگر اس زمانہ میں کسی تعطیل کی وجہ سے کتب خانہ بند تھا۔

القصہ ایک ہفتہ تک فرانس کی دار السلطنت میں اور فرانسیسی تہذیب و تمدن کے مرکز پر جو کچھ دیکھ سکے خوب دیکھا۔ اور اس کے بعد ۱۶۔ اپریل کو وہاں سے روانہ ہو گئے۔ اسٹیشن پر ترک اجاب نے خدا حافظ کہا۔ اور شب بھر ٹرین میں گزار کر دوسری صبح کو میں اور ڈاکٹر انصاری صاحب سوئزرلینڈ کی سرحد میں داخل ہوئے۔

فردوس یورپ

اس سارے سفر میں جو چیزیں سے زیادہ بے لطف اور بہ مزہ کرنے

والی تھی۔ وہ سرحدوں پر پاسپورٹ کا معاائنہ اور اسباب کی تلاشی تھی۔ ہر ملک کی سرحد پر داخل ہوتے ہی بلکہ داخل ہونے سے پہلے ہی نامہ اعمال کی طرح اول پاسپورٹ کا معاائنہ کرائیے اس کے بعد اپنے اسباب سفر کو کھولتے اور ہر چیز دکھائیے۔ (ایسا نہ ہو کہ آپ کوئی معمولی چیز یا کوئی ایسی شے جس کے داخلہ کی ممانعت ہے لٹے جا رہے ہوں) پھر سب سے بڑی مصیبت یہ کہ ہر ملک میں ایک نئی زبان۔ انگریزی سے کام چلنا مشکل۔ فرانسیسی میں کچھ شہد ہو تو خیر۔ ورنہ گونگے۔ بہروں کی طرح اشاروں سے کام چلائیے۔ حاصل خانہ اور پاسپورٹ کا دفتر ایک مینارہ بابل ہوتا ہے۔ قسم قسم کی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ اور ہر شخص زبان سے اشاروں سے اور نظر سے جس طرح ہو سکتا ہے اپنا مطلب سمجھاتا ہے۔ سویزر لینڈ کی سرحد پر میں تو بدو اس ہو گیا۔ گاڑی جانے کے لئے تیار۔ سامان حاصل خانہ میں۔ پاسپورٹ ایک پولس کا آدمی لے گیا تھا۔ وہ لایا نہیں۔ فرانسیسی زبان کے دو چار ٹوٹے پھوٹے الفاظ بولتے ہیں مگر کوئی نہیں سمجھتا۔ اشارے کرتے ہیں تو بھی مطلب براری نہیں ہوتی۔ راستہ معلوم نہیں۔ کس سے پوچھیں۔ غرض اس سفر کے لطف کی ساری کسر ان موقعوں پر نکل جاتی تھی۔ ۱۷-۱۸ اپریل کی صبح کو جینوا پہنچے۔ اور چند گھنٹہ وہاں قیام کر کے شام کو پانچ بجے روانہ ہو گئے اور دو گھنٹہ بعد تیرتے پہنچ گئے۔ جہاں تین چار دن ٹھہر کر ترک بھائیوں سے بھی ملنا تھا۔ اور سویزر لینڈ کی سیر بھی کرنی تھی۔ جینوا میں ڈاکٹر بسیم عمر پاشا ترک کی انجمن ہلال احمر کے صدر موجود تھے۔ ڈاکٹر انصاری صاحب بخار میں مبتلا تھے۔ اس لئے میں ان کے ہوٹل کو گیا۔ اور ان کو موجود نہ پا کر ایک پرچہ چھوڑ آیا۔ تھوڑی ہی دیر بعد بیچارے تشریف لائے۔ اور عرصہ

تک نہایت محبت سے باتیں کرتے رہے۔ عمر بزرگ ہیں اور فن طب میں
 بہت مشہور ہیں۔ یہاں تک کہ یورپ کے بہترین ڈاکٹروں میں ان کا شمار
 ہے۔ اب صرف انجمن ہلال احمر کے ذریعہ سے اپنے ملک کی خدمت کرتے
 ہیں۔ باقی سیاسی مشاغل سے کنارہ کش ہیں۔ ان سے یونانیوں کے مظالم
 کی ایک خون کو کھولا دینے والی داستان سُنی۔ شام کو ہجے جینواسے چلنے
 اور رات کو ۸ بجے تڑپتے پہنچ گئے۔ وہاں ہم کسی سے واقف نہ تھے۔ مگر
 پیرس سے بعض دوستوں نے اطلاع کر دی تھی۔ اور اسعد بے ہمارے
 منتظر تھے۔ پیارے اسی وقت ڈھونڈتے ہوئے ہوٹل میں پہنچے۔
 جہاں ہم پہنچ چکے تھے۔ ہمارے پہنچنے سے پہلے ہی اسعد بے نے ہمارے
 قیام کے لئے خاص طور پر کمروں کا انتظام خود کیا تھا۔ اور گویا اس طرح
 ہم کو اپنا مہمان بنالیا تھا۔ آتے ہی انہوں نے فرمایا۔ کہ میرا مکان ہوٹل
 کے متصل ہے۔ کھانا وہاں تیار ہے۔ چلئے۔ چونکہ ڈاکٹر صاحب کی صحت
 اچھی نہ تھی۔ ہم نے معذرت کی۔ اور وعدہ کیا۔ کہ علی الصبح آئیں گے۔
 صبح ہم باہر جانے کے لئے تیار بھی نہ تھے۔ کہ اسعد بے مہم چند اور احباب
 کے تشریف لے آئے۔ پہلے یہ بتا دوں کہ اسعد بے مارشل فواد پاشا کے
 فرزند ہیں جو سلطان عبدالحمید خان کے زمانہ میں ایک بڑی شخصیت رکھتے
 تھے۔ اور اب بھی قسطنطنیہ میں وہ ایک بڑی حیثیت والے شخص سمجھے جاتے
 ہیں۔ خود اسعد بے عرصہ تک فوجی خدمت انجام دے چکے ہیں۔ اور پہلی
 جنگ بلقان میں بھی شریک ہو چکے ہیں۔ ایک تعلیم یافتہ اور خوشرو نوجوا
 ہیں۔ طلعت پاشا مرحوم کے علاوہ متحدہ وزراء کے پرائیویٹ سکرٹری بھی رہے
 چکے ہیں۔ اور نوجوان تہ کوں سے خاص تعلقات رکھتے ہیں۔ اتحادیوں

کے دست دراز سے بچ کر سوپر لیٹڈ میں پناہ گزیں ہیں۔ ترکوں کے اسلامی اخلاق و محبت کا ایک دل آویز نمونہ ہیں۔ اور ان سے زیادہ اُن کی اہلیہ محترمہ شہزادی زیبا اسعد جن کے اندر میں نے اسلامی نسوانیت کی ایک سچی تصویر دیکھی۔ موجودہ سلطان مصر کی بھتیجی ہیں۔ اور بہت دولت مند ہیں۔ مگر ان کی سادگی۔ مذہبی اور قومی جوش اور اسلامی محبت نے ہمارے دلوں میں ایسے نقش بنا دیئے ہیں۔ جو کبھی محو نہیں ہو سکتے۔ میرے دل میں تو ان تمام احباب کی خوبیاں دیکھ دیکھ کر بار بار وہی ایک سوال پیدا ہوتا تھا۔ کہ ان کے مرد ایسے اور خواتین ایسی۔ پھر یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ ترک دنیا میں عزت کے ساتھ زندہ نہ رہ سکیں؟ ہم چار دن تربیتے ہیں رہے۔ اسعد بے کے ہمان تھے۔ دونوں وقت ان ہی کے مکان پر کھانا کھاتے تھے۔ شہزادی زیبا کی ہمان نوازیوں کی یاد دل میں ہر وقت تازہ ہے۔ زیادہ لکھتے ڈرتا ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ مبالغہ سمجھا جائے۔ دو چار مثالیں کافی ہونگی۔ پہلے ہی دن کہیں ڈاکٹر انصاری صاحب نے ازراہ مذاق میری نسبت یہ کہہ دیا۔ کہ ٹیٹھی چیزیں کھانے کا بہت شوق ہے (اور جھوٹ کیوں بولوں۔ کچھ غلط بھی نہ کہا تھا!) اس کے بعد یہ حالت تھی۔ کہ دونوں وقت کئی کئی قسم کا میٹھا و سترغوان پر ہوتا تھا۔ خود شہزادی پکاتی تھیں۔ اور پھر اصرار کے ساتھ اس قدر کھلاتی تھیں۔ کہ ڈاکٹر انصاری تو گھبرا گھبرا کر کہتے تھے۔ کہ کہیں بیمار نہ ہو جاؤ۔ مگر ازل تو میٹھا خود ہی ایسی چیز ہے کہ انسان کی عمر بڑھاتا ہے۔ علاوہ اس کے سچی محبت سے پکایا جانے اور محبت سے کھلایا جائے۔ ایسی حالت میں بیمار ہونا محال! چنانچہ سوپر لیٹڈ میں سفر کی ساری تکان بھی جاتی رہی۔ اور ترکی کھانوں خصوصاً میٹھے

کھانوں کا وہ لطف اٹھایا۔ کہ اب شاید کبھی نصیب نہ ہو! برسبیل تذکرہ اگر زبان سے کہدیا۔ کہ فلاں چیز خریدنی ہے۔ تو شام کو ہوٹل میں ایک پارسل موجود ہے۔ جب ہم ان مہمان نوازیوں سے شرما کر شکایت کرتے تھے۔ تو جواب ملتا تھا۔ کہ اچھا ہم ہندوستان آئیں تو تم بھی اسی طرح مہمان داری کر لینا! میں کیا بتاؤں کہ جب وہ یہ کہتے تھے۔ تو میں اپنے جی میں کس قدر محجوب و مغموم ہوتا تھا۔ ہندوستان میں مسلمان تو ہیں۔ مگر یہ باتیں کہاں سے

چہ بود متاع خسرو کہ کند نثار جانان
مگسے چہ طعمہ دارد بدماں باز کردن!

ابھی تو ہندوستان کے مسلمان ان مجاہدین اسلام کے پاؤں کی خاک بھی نہیں ہے۔ جو آج صدیوں سے ناموس اسلامی کے محافظ ہیں۔ اور اُسی کے نام پر مردانہ وار اپنی جانیں دے رہے ہیں! اسعد بے اور تقریباً تمام دوسرے احباب انگریزی خوب بولتے ہیں۔ اس لئے لطف صحبت ایسا تھا۔ کہ تربیت کی صحبتوں سے جدا ہونا شاق گزرا۔

اسعد بے کے مکان کے قریب ہی ایک دوسرے بھائی فواد بے بھی مقیم تھے۔ ایک معمر شخص ہیں۔ اور اچھا علمی مذاق رکھتے ہیں۔ عربی زبان کے دلدادہ ہیں۔ حتیٰ کہ ان کے گھر میں بچے بھی ترکی زبان کی بجائے عربی بولتے تھے۔ اور جب ان کو معلوم ہوا۔ کہ ہم لوگ عربی نہیں بول سکتے۔ تو حیران ہوئے۔ اور کہنے لگے۔ کہ جس عالمگیر اتحاد اسلام کا خواب ہم سب دیکھ رہے ہیں۔ وہ عربی زبان کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔ فواد بے بھی دولت مند شخص ہیں۔ مصر میں مقیم تھے۔ اور جب سے سویڈر لینڈ آئے

ہیں یا آنے پر مجبور کئے گئے ہیں۔ اپنی ذاتی آمدنی کا ایک پیسہ بھی ان تک نہیں پہنچتا۔ ان کے چھوٹے چھوٹے خوب صورت بچے ہم لوگوں سے خوب مانوس ہو گئے تھے۔ فواد بے کے ایک عزیز شیریں بے واقعی اسم باسٹے ہیں۔ وجیہ نوجوان ہیں۔ اور فی الحقیقت شیریں ہیں اکم سخن ہیں۔ مگر جب باتیں کرتے ہیں تو دل موہ لیتے ہیں۔ اسعد بے اور فواد بے کے ان دو گھروں میں میری زندگی کے یہ تین چار دن بہترین تھے۔ جو گزر گئے۔ یہ ایک حسن اتفاق تھا۔ کہ فواد بے مفتی عہد کے شاگرد نکلے۔ اور اس سلسلے سے استاد اعظم حضرت جمال الدین افغانی کے حالات سے بھی خوف واقف تھے۔ میں ایک عرصہ سے سید جمال الدین کی سیرت مرتب کر رہا ہوں۔ اور چاہتا ہوں۔ کہ جو کچھ بھی میری محدود قابلیت ہے۔ وہ سب اُس کی ترتیب و تکمیل میں صرف ہو جائے۔ اور جس پایہ کا وہ شخص تھا۔ اسی شان کی ایک کتاب تیار ہو سکے۔ لیکن یہ تنہا میرے بس کا کام نہیں۔ جہاں جہاں سے ممکن ہو تا ہے معلومات حاصل کرتا جاتا ہوں۔ اس کی ترتیب کا وقت آنے کا تو کسی بڑے شخص کی خوشہ چینی کروں گا۔ مجھے فواد بے سے بہت سے حالات معلوم ہوئے۔ اور ایک دن میں نے کئی گھنٹہ اسی کام میں صرف کئے۔ اور سید جمال الدین کے متعلق جو کچھ ان کے دماغ میں محفوظ تھا حاصل کر لیا۔

اسعد بے سے اکثر سیاسی اور اسلامی مسائل پر گفتگو ہوئی۔ اور نوجوان ترکوں کے متعلق بہت سی قیمتی معلومات حاصل ہو سکیں۔ چونکہ انقلاب کے بعد بنگ بلقان کے اختتام تک اسعد بے خود نوجوان ترکوں کی جماعت کے ساتھ کام کرتے رہے ہیں۔ اس لئے ان کے بیانات بہت زیادہ قابل وثوق پاتے۔

علاوہ بریں میں نے محسوس کیا۔ کہ اسعد بے کبھی گفتگو میں کسی کے خلاف یا موافق ضرورت سے زیادہ جوش یا تشدد نہیں کرتے۔ انہوں نے نوجوان ترکوں کے اوصاف بھی بتائے اور انکی غلطیاں بھی بتائیں۔ اور ان سے معلوم ہوا۔ کہ سب سے بڑی ٹھوکر جو ترکوں نے کھائی تھی۔ وہ یہی تھی۔ کہ تحریک اتحاد اسلامی سے قطع نظر کر کے وہ تحریک اتحاد تورانی پر زور دیتے رہے۔ اور اس طرح چاہتے یہ تھے۔ کہ ترکوں کی ایک جغرافیائی قومیت قائم ہو جائے۔ جس میں ہر مذہب شامل ہو اور جو خارجی اُمیدوں سے بے نیاز ہو۔ ہندوستان میں بھی بعض دوست اس غلطی میں مبتلا ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں۔ کہ ہندوستانی قوم پرست صرف دہی ہو سکتا ہے۔ جو تمام خارجی تعلقات سے قطع نظر کر لے۔ حالانکہ حب وطن کے لئے میرے خیال میں یہ شرط لازمی نہیں ہو سکتی۔ اس عالمگیر اخوت کے شیرازہ کو درہم دہرم کر کے مسلمان اپنی قومیت کے ایک بڑے عنصر کو برباد کر دیں گے۔ اُس کے بعد انکی نمایاں خصوصیت کوئی باقی نہیں رہتی۔ جو ان کے قومی اقتدار کو قائم رکھے۔ اس اصلی قومیت کو قائم رکھ کر ہی ہندوستان کے مسلمان ملک کی متحدہ قومیت کا با اثر جزو ہو سکتے ہیں۔ ورنہ انکی قیمت کچھ نہ ہوگی۔ اور جب قیمت نہ ہوگی۔ تو وہ ملک کے سرمایہ میں حصہ دار کیونکر ہو سکتے ہیں! قومیت کا یہ غلط تخیل جس قدر جلد مٹا ہو جائے بہتر ہے۔ یہ موقع تفصیل کے ساتھ گفتگو کرنے کا نہیں ہے۔ لیکن انشاء اللہ سید جمال الدین کی سیرت میں۔ جو تحریک اتحاد اسلامی کے سب سے بڑے داعی تھے۔ میں اس بحث کو بہت زیادہ صاف کر دوں گا۔

اسعد بے سے طلعت پاشا اور انور پاشا کے بہت سے حالات معلوم ہو

اور پربیل تذکرہ انہوں نے بیان کیا۔ کہ مصطفیٰ صغیر نامی ایک شخص انکورا گیا ہوا ہے۔ جہاں پہلے دھوکہ ہوا۔ مگر اب پتہ چلا ہے۔ کہ وہ کوئی جاسوس ہے۔ غالباً یہ وہی مصطفیٰ صغیر ہیں۔ جن کی گرفتاری اور سزا سے موت دیئے جانے کی خبریں کچھ عرصہ ہوا ہندوستان آئی تھیں۔ ہم نے تریتے میں سنا۔ کہ یہ حضرت عرصہ سے سارے یورپ کا چکر لگا رہے تھے۔ اور ہر جگہ ترکوں سے ملتے تھے۔ اور ظاہر کرتے تھے۔ کہ میں ہندوستان کے وطن پرستوں کا نمایندہ ہوں۔ اور کار خاص پر متعین ہوں!

۲۱۔ اپریل کی صبح کو ہم بادل ناخواستہ تریتے سے رخصت ہوئے۔

رومتہ الکبریٰ

وادئ سپین کی سرنگ سے رجو دنیا کی سب سے بڑی سرنگ کسی جاتی ہے) ہماری ٹرین ایک گھنٹہ میں گزری اور اب ہم اٹلی کی سرحد کے اندر داخل ہو گئے۔ اطالوی تہذیب کا پہلا نمونہ میلان اسٹیشن پر دیکھا۔ جہاں ہم گاڑی بند کرنے کے لئے دو گھنٹہ ٹھہرے تھے۔ کھانا کھانے کے لئے اسٹیشن کے ہوٹل میں گئے۔ اطالوی سوسائٹی کا وہ پہلا منظر ہمیشہ یاد رہے گا۔ لوگ کہتے ہیں۔ کہ نقش اول زیادہ قابل اعتبار نہیں ہوتا۔ مگر بعض طبائع نقش اول سے بہت کچھ احتیاط کر لیتے ہیں۔

اُس شب کو میلان اسٹیشن کے ہوٹل میں میں نے سیکڑوں اطالوی مردوں

۱۔ مصطفیٰ صغیر صاحب نے ہندوستان کی نمایندگی کا حق جس قابلیت کے ساتھ انکورا میں ادا کیا۔ اسکی حقیقت واضح ہو چکی ہے۔

اور عورتوں کو کھانا کھاتے دیکھا۔ اُس منظر کی بدتمیزی اور گندگی بیان سے باہر ہے۔ ہمارے پاس ہی لوگ بیٹھے ہوئے کھانا کھا رہے تھے۔ اور اس طرح گوشت کے ٹکڑوں کو دانتوں میں لے کر چیرتے اور ہڈیوں کو چباتے تھے۔ کہ بے اختیار یورپ کا عہد وسطیٰ یاد آتا تھا۔ ایک چیز ہمارے ہندوستان کی سوئس کی صورت کی۔ مگر ٹکین اور ہندوستان کی موٹی سے موٹی سوئس سے بھی بیس گنی زیادہ موٹی رکابیوں میں بھر بھر کر لائی جاتی تھی۔ اور وہ خدا کے بندے اس شوق سے اس کو کھاتے تھے۔ کہ گویا ایک نعمت ہے۔ بعد کو معلوم ہوا۔ کہ (Macaroni) اطالوی قوم کا قومی کھانا ہے۔ اور ان کو بہت ہی مرغوب ہے۔ کچا آتا۔ اسکی موٹی موٹی سوئس بالکل مونج کی رسی کے ٹکڑے۔ ان میں نمک مرچ پڑا ہوا رکابی سے منہ تک لٹکتے ہوئے جاتے تھے۔ اور پھر جبرے بھی چلتے تھے۔ اور ان ٹکڑوں کا ایک حصہ منہ کے باہر بھی لٹکتا رہتا تھا۔ جیسے جانوروں کے منہ سے گھانس چھری کاٹا میز پر ہوتا ہے۔ مگر ان اشیاء کا استعمال کچھ برائے نام ہے۔ سوائے اچھے ہوٹلوں کے جہاں ذرا صفائی کا زیادہ خیال معلوم ہوتا ہے۔ مگر وہ زیادہ بھی اتنا۔ کہ ہم ہاتھ سے کھانے والے لوگ پھر بھی اس کو گندگی اور بدتمیزی سمجھتے تھے! خدا کی پناہ! اُس دن کس قدر مشکل سے چند تقمے کھائے۔ ہوٹل کی وہ فلاطت اور کھانے والوں کی وہ بدتمیزی وہ ہجوم۔ وہ شور۔ جبرڈ کے چلنے کی وہ آواز! معاذ اللہ!

منا تھا۔ کہ اطالوی حسین ہوتے ہیں۔ مگر ہم نے تو حُسن کے آثار بھی کم دیکھے۔ البتہ یہ ضرور دیکھا۔ کہ عورتیں فرانس کی وضع و قطع کا منہ چڑاتی ہیں! اور ہر جگہ تھیشٹروں اور بازاروں میں اسکی کوشش و خواہش نظر آتی ہے۔ کہ پیرس

کی نقل اُڑائی جائے۔

ہم میلان سے دوسری گاڑی میں سوار ہو کر صبح کو روم پہنچے۔ ہوٹل پہنچنے کے بعد طبیعت کو بد مزہ کرنے والا پہلا واقعہ تو یہ پیش آیا۔ کہ ہمارا جو سامان بعد کو اسٹیشن سے لایا گیا۔ اس کو چنگی کے اہلکاروں نے اس بری طرح کھولا اور دیکھا تھا۔ کہ بعض چیزیں ٹوٹ گئیں۔ بعض کپڑے خراب ہو گئے۔ اور پھر گودڑ کی طرح کمسوں میں بھر دیئے گئے!

تیسری چیز یہ معلوم ہوئی۔ کہ ہوٹل کے ملازمین (حالانکہ وہ ہوٹل ایک اچھا ہوٹل سمجھا جاتا ہے) تقریباً سب کے سب مسافروں کی ناواقفیت سے بہت زیادہ ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اور ہر وقت اس کوشش میں رہتے ہیں۔ کہ جس کسی کی جیب میں ہاتھ پڑ سکے کچھ حاصل کر لیں۔ بعد کے تجربوں نے بتایا۔ کہ اہل اطالیہ (خصوصاً شہری آبادی) عام طور پر بہت طامع اور خود غرض ہوتے ہیں!

اب صرف دو چیزیں بیان کروں گا۔ اول روم کے آثار قدیمہ جن کو اچھی طرح دیکھا۔ اور عبرت کی نظر سے دیکھا۔ دوسرے ترک اجاب کی ملاقاتیں! روم کی پُرانی دیواروں اور شکستہ عمارتوں پر گویا ہزاروں برس کی تاریخ کندہ ہے! اہل نظر ان آثار قدیمہ میں جس سے سارا شہر بھرا پڑا ہے۔ سب کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ روم کی تاریخ درحقیقت دُنیا کی تاریخ ہے۔ میں جو کچھ کتابوں میں پڑھ چکا تھا۔ سب ان آثار کو دیکھ کر تازہ ہو گیا۔ ان مقامات کے دیکھنے میں مجھے ایک عجیب لطف آتا تھا۔ جو تاریخی واقعات کتابوں میں پڑھتے۔ وہ گویا نظر کے سامنے تھے۔ سینر کہاں قتل کیا گیا تھا۔ ایتھوئیس نے کس جگہ کھڑے ہو کر تقریر کی تھی۔ سینرو نے کن عمارتوں کو جلا کر رکھ دیا تھا۔

سینٹ پیٹرس کہاں مارے گئے تھے۔ اور کیونکر دفن ہوئے تھے۔ کلیڈیس جس نے قوم کو تھکے تین لاکھ نفوس کو تہ تیغ کیا تھا۔ اس عہد جدید کی خوں آشامیوں کے مقابلہ میں وہ قتل عام ایک کھیل ہو گا! کس جگہ دربار کرتا تھا۔ وہ پہل کس موقع پر تھا۔ جس پر ہورتیس نے پور سینا کی فوجوں کو روکا تھا۔ وغیرہ وغیرہ پورے ڈھائی ہزار برس کی تاریخ پیش نظر تھی۔ اور خدایا داتا تھا!

روما کی تاریخ قدیم کے راز اسکی اینٹوں میں پنہاں ہیں۔ کوئی پتھر نہیں جس پر خون کے دھبے نہ پڑے ہوں۔ ہر گھر کسی نہ کسی دردناک واقعہ کی یادگار ہے۔ ہر پُرانا درخت ایک گواہ ہے جس نے بہت سے خوفناک مناظر دیکھے ہوں گے۔ ہر پھول جو اُس سر زمین پر اگا ہوا ہے۔ اس نے مٹی میں جذب ہو جانے والے خون سے زندگی پائی ہوگی۔ اور وہ جب کھلتا ہے۔ تو گویا کسی نہ کسی قبر پر کھلتا ہے!

رومہ الکبریٰ کے بانی دو جگہ انسان بتائے جاتے ہیں۔ جن کو ایک بھیڑیے نے پرورش کیا تھا۔ شہر کے خاص خاص مقامات پر ایک تصویر اکثر نظر آتی ہے جس میں دو انسان کے بچے ایک بھیڑیے کی مادہ کا دودھ پیتے نظر آتے ہیں۔ جانوروں اور انسانوں کے بچوں کے متعلق اس قسم کی حکایتیں کوئی نئی چیز نہیں ہیں۔ فردوسی نے رستم کے بیٹے کو کوہ البرز کی چوٹی پر عقاب کے گھونسلے میں پرورش کرایا۔ نینوا کی سلطنت کے بانی کو اس کے بچپن میں فاختہ دانہ کھلاتی تھی۔ خود ہندوستان میں اس طرح کے بہت سے قصے مشہور ہیں وسط ہند کے گوٹھوں کی زندگی بھی شیر کی حکایتوں سے وابستہ ہے۔ غرض یہ کوئی نیا توہم نہیں ہے۔ مگر اٹلی میں تو رومیلس اور ریمس اور بھیڑیے کی مادہ

(اجوان کو دودھ پلاتی تھی)۔ قومی تاریخ کا ایک جزو ہو گئے ہیں۔ اور انہی تصویر
ایک قسم کا قومی نشان سمجھی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ ایک دو مشہور عمارتوں کے دروازوں
پر کٹھروں میں زندہ بھیڑیے بند ہیں۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا۔ کہ وہ
اطالوی قوم کی گرگ زادگی (اگر اس اصطلاح کا استعمال کرنا بیجا نہ ہو) کا
قومی نشان ہیں اور حقیقت اہل روم گرگ زادہ یا پروردہ آغوش گرگ ہیں
یا نہیں۔ خدا کو معلوم ہے۔ مگر جن لوگوں نے جنگ طرابلس کے حالات پڑھے
ہیں۔ وہ تو ایک حد تک انہی درندگی سے انکار نہیں کر سکتے!

یورپ میں کہتے ہیں۔ کہ اگر انسان کے کیرکیٹر و اخلاق کا اندازہ کرنا ہو
تو آدمی کو اس وقت دیکھئے۔ جب وہ کھانا کھانے بیٹھے۔ میں نے اطالوی
مرد اور عورتوں کو گوشت اور تقریباً کچے گوشت کے ٹکڑے دانتوں سے چیرنے
پھاڑتے دیکھا ہے! بہر حال رومیس اور ریمس کی اولاد بھیڑیے کی خصوصیات
سے دو ہزار برس بعد بھی محروم نہیں ہوتی ہے۔ گو اب ان کے جسم کے لمبے
بال باقی نہیں۔ اور صدیوں تک انسانی تہذیب و تمدن کے سایہ میں پرورش
پاکر اب ایک اچھا ملمع ہو گیا ہے۔ تاہم وہ کچھ نہ کچھ اپنی دایہ کی روایات کو
روشن رکھتے ہیں! رومہ الکبریٰ کی سات پہاڑیوں پر آج جو آبادی پھیلی ہوئی ہے
اس کا رشتہ عہد ماضی کی بہیمیت ہے۔ منقطع ہوا ہو مگر بالکل منقطع نہیں ہوا۔ کچھ
نہ کچھ باقی ہے!

رومہ الکبریٰ کی ابتدا یوں ہوتی ہے:-

چند چرواہوں نے کسی پہاڑی پر اپنا گاؤں آباد کیا۔ اور قضا و قدر نے
ایک ایسی حکومت کی بنیاد ڈال دی جس کے تاجداروں نے صدیوں تک
دنیا میں نور و ظلمت کے ہنگامے برپا رکھے! جس طرح آدم کی عمر میں پہلی

دفعہ عورت نے انقلاب پیدا کیا تھا۔ جس کے تلخ ثمرات آج ہم کو کھانے پڑ رہے ہیں۔ اسی طرح روم کی تاریخ میں پہلی دفعہ ایک عورت نے انقلاب عظیم پیدا کیا۔ وہ قصہ بہت دلچسپ ہے۔ ایک حسین عورت کا حسن و لیعہد سلطنت کو بے اختیار کر دیتا ہے۔ اور وہ نوجوان رات کو برہنہ تلوار لیکر اُس عورت کے سر ہانے جاتا ہے۔ اور کہتا ہے۔ کہ میں اس سلطنت کا ولی عہد ہوں۔ تلوار میرے ہاتھ میں ہے۔ تیری عصمت آج کی شب میری تلوار پر قربان ہونی چاہئے! اُس عورت کا غور و سوانیت چمکتے ہوئے فولاد سے مرعوب نہیں ہوتا۔ مگر وہ شاہزادے کی بہیمانہ طاقت سے ناچار مغلوب ہوتی ہے۔ اور صبح کو اپنے شوہر اور باپ کے سامنے اپنی رسوائی کا حال سنا کر خود کشی کر لیتی ہے۔ اس کی لاش سامنے پڑی ہے۔ اور بروکس اسی چھری کو اٹھا کر جس سے ابھی ابھی اس عورت نے اپنا کام تمام کیا ہے۔ قسم کھاتا ہے۔ اور کہتا ہے اُس معصوم خون کی قسم جو اس چھری سے ٹپک رہا ہے۔ دیوتا میرے گواہ ہیں۔ میں مغرور تارگوین سے انتقام لوں گا۔ اُس سے اور اسکے اہل و عیال سے یہ چھری انتقام لیگی۔ اور اس چھری کی قسم اور اس خون کی قسم آئندہ وہ مغرور اور اسکی اولاد میں سے کوئی اس ملک پر حکومت نہ کر سکے گا۔

وہ لاش سر بازار رکھی ہوئی ہے۔ اور ہزاروں انسان آتے ہیں۔ اور بادشاہ کے خلاف بغاوت کا حلف اٹھاتے ہیں۔ اس طرح ایک خونین عہد کا آغاز ہوتا ہے۔ اور آخر حکمران خاندان کا ایک بچہ بھی ملک میں باقی نہیں رہتا۔ اور اہل ملک اپنی ایک جمہور یہ قائم کرتے ہیں۔ یہ دو ہزار برس کا واقعہ ہے۔ لیکن آج بھی اس عورت کا نام تاریخوں میں روشن ہے۔ جس کے خون نے ایک حکمران خاندان شاہی کی بنیادیں ہلا دیں! اُس واقعہ کو

داستان کُن کیوں کہتے۔ انسانوں کے دلوں میں مظلومیت اور انصاف کے
 جذبات کو بلکہ تمام جذبات عالیہ کو عورت ہی ہمیشہ پیدا کرتی ہے۔ وہ قوم کہاں
 ہے۔ جسکی قومیت عورت کے انقلاب انگیز وجود کی مرہون منت نہ ہو، جب
 روما کی سر زمین پر دولت کے کرشمے نظر آنے لگے۔ اور حکومت و طاقت کا
 دائرہ وسیع ہو چلا۔ انسان انسان کو غلام بنانے لگے۔ اور غلامی کا وہ پینٹناک
 عہد شروع ہو گیا۔ جب لاکھوں انسان کتوں سے بدتر حالت میں مبتلا ہو گئے۔
 یہ وہ عہد تھا جس کے اثرات نے تمام یورپ کو بدترین ہیمنیت میں مبتلا کر دیا۔
 اور حیوانیت کی اُن شرمناک خود پرستیوں میں تمام بڑا عظم کو گندہ کر دیا۔ جسکی
 ایک ادنیٰ مثال آندلس کی مذہبی عدالتیں تھیں۔ اگر عرب میں اسلام کی روشنی
 نمودار نہ ہو گئی ہوتی۔ تو شاید آج ساری دُنیا اس غلامی کے زنجیروں میں
 گرفتار ہوتی، وہ زمانہ تھا۔ کہ حکومت روما کی فتوحات کا سلسلہ یونان تک
 پہنچ چکا تھا۔ اور مفتوحہ ممالک سے ہزار ہا غلام پایہ زنجیر آتے تھے۔ اور بازاروں
 میں ترکاریوں کی طرح فروخت ہوتے تھے۔ اہل رومایونان کی عظمت اور
 اس کے علم و فضل اور اسکی صنایعوں کو دیکھ کر حسد کرتے تھے۔ وہ دماغ
 ان کو نہیں ملا تھا۔ جس نے اہل یونان کو دُنیا کا استاد بنایا۔ لیکن رومایونانیوں
 کی علمی عظمت کا بہتر نمونہ بنانے کی خواہش رومیوں کو ملک گیر سی پر آمادہ کرتی
 تھی۔ رفتہ رفتہ یونان کے بہترین خزانے صنعت و علم کے بہترین ذخائر جو ما
 جمع تھے۔ روماء کی فاتح فوجوں کے ذریعہ سے اٹالیہ میں لائے گئے۔ اور آج
 تک موجود ہیں۔ صرف ایک فاتح مرکس فلویس اپنے صرف ایک حملہ کے بعد
 تاریخ ہم کو بتاتی ہے۔ کہ سیکڑوں من سونا۔ کروڑوں طلائی سکے۔ ۲۸۵ فولادی
 محبسے (قد آدم) ۲۲۰ سنگ مرمر کے محبسے۔ تصویریں اور صنایعی کے بہترین نمونے

روم میں لایا۔ اس طرح وہ خزانے جمع ہوئے جن کا ایک عکس پاپا کے عجائب خانہ میں سیاح کہ نظر آتا ہے۔ اطالوی قوم کے اندر جو ہر اصلی نہ جب تھا نہ اب ہے۔ مگر انہوں نے یونان کی نقل شروع کی۔ اور خوب کی۔ اطالیہ کی تاریخ کا مطالعہ مجھے اسی نتیجہ پر پہنچا تھا ہے۔ کہ بلحاظ شعور اور دماغ یہ قوم کبھی کوئی بلند پایہ نہ کھتی تھی۔ البتہ اس نے کسی حد تک یونان کے کمالات کی نقل اُٹھائی۔ اور اسی سلسلہ میں دو چار ایسے صنائع اور مصور بھی پیدا کئے جو اپنی مخصوص دماغی قابلیت پر ناز کرنے کا حق رکھتے تھے۔ بحیثیت مجموعی اور از روے انصاف سوائے اس کے کچھ نہیں کہا جاسکتا۔ روم میں سپاہی تو تھے۔ مگر اہل علم کبھی نہ تھے۔ تلواریں تھیں۔ قلم نہ تھا۔ اور ایک قومی خصوصیت اور بھی تھی۔ وہ معمار تھے۔ اور عمارتوں سے اپنی قومی عظمت جتلاتے تھے۔ ان کی نظر میں عظمت کا معیار ہر چیز کی جست یعنی عمارتوں کی خوبصورتی ہو یا نہ ہو۔ مگر ان کی بلندی۔ اچھا جسم۔ ان کے محرابوں کی وسعت۔ اچھا استحکام یہ چیزیں تھیں جو قومی فخر و سخوت کی مظہر تھیں * ایک فلسفی جب اس کلیہ کو ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ کہ تہذیب و تمدن اور معاشرت۔ اور ان سب کی دایہ دولت۔ جس قدر زیادہ بڑھتی ہے۔ اسی قدر حیوانیت اور بد اخلاقی بھی ترقی پاتی ہے۔ تو بظاہر یہ وہ چیزیں کس قدر متضاد نظر آتی ہیں۔ مگر فلسفی کے اس کلیہ کو ثابت کرنے کے لئے تاریخی واقعات کا ایک نامنتہائی سلسلہ پیش نظر ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کی اعلیٰ یورپین تہذیب نے انتہائی بہیمیت کے جو مناظر دنیا کے سامنے پیش کئے وہ کوئی نئی چیز نہیں۔ دنیا میں اکثر یہی ہوتا رہا ہے۔ انسان کا تمدن جب زیادہ اعلیٰ اور اسکی معاشرت زیادہ پُر تکلف اور اس کے علوم و فنون زیادہ وسیع ہوتے ہیں۔ تو نفس لیم بھی زیادہ طاقتور ہو جاتا ہے۔ سلطنت روم کی عظمت کا وہ زمانہ جب دنیا

کے نظریں رومنہ الکبریا کے دروازوں پر لگی رہتی ہیں۔ اور مسیحیت کا استغاثہ عظیم عیسائی دنیا میں دیتا سمجھا جاتا ہے۔ دنیا کے خزانے روم کی سڑکوں پر پڑے ہوئے ہیں۔ اور تاجداروں کے سروں کو ادنیٰ ادنیٰ سپاہی ٹھکرا دیتے ہیں۔ وہ زمانہ طاقت۔ دولت اور تمدن کا بہترین زمانہ کہا جاتا ہے۔ لیکن عین اسی زمانہ میں بہیمیت اور خواتخاری کی بدترین مثالیں موجود ہیں انیسویں کی خون آشامیاں ان خوریزیوں کے مقابلہ میں کچھ بھی نہ تھیں۔ جو مسیحیت کے مرکز پر اس عہد میں رونما ہوئیں۔ جب روم اور اُس کے استغاثہ کی بلند اقبالی دنیا میں اپنے ڈنکے بجا رہی تھی۔ دارالسلطنت کی وہ تباہی کچھ بھی نہ تھی۔ جو عہد اول کے تاجداروں کے ماتحتوں عمل میں آئی۔ اُس آتشزدگی اور خوریزی کے مقابلہ میں جس کا دور تہذیب و تمدن میں روم آشکار ہوتا تھا۔ سولہویں اور سترھویں صدی کی رومن تاریخ اور ابیسویں صدی کے تمدن کا باہم تقابل اہل نظر کے لئے کچھ ایسا مشکل نہیں۔

مسیح کے جانشین جو مسند حکومت پر ہینیاں اور نیرو سے کچھ کم نہ تھے۔ اپنی روحانی چادروں کو لاکھوں انسانوں کے خون سے رنگتے تھے۔ اور ان کی عباے تقدس پر ہوس۔ عیش پرستی اور دنیا طلبی کے ایسے دھبے لگتے تھے۔ جو آج تک عیسائی مورخین کے مٹائے نہ مٹ سکے۔ قوموں کی اقبال مندی کی وہ ایک عبرت انگیز مثال ہے۔ کہ مسیحیت کا استغاثہ عظیم کبھی شمشیر برہنہ نہ کر میدان جنگ میں مسیحی روحانیت کی داد دیتا ہے۔ اور کبھی

۱۔ دس کیتھولک عقاید کا مقتدا کارڈنل بیردینس کھلے الفاظ میں کہتا ہے۔ ”ہر بات سے ایسے لوگ پاپاے روم کے تخت پر بیٹھ چکے ہیں جنہیں ہم دیو اور شیطان کے نام سے بھی یاد نہیں کر سکتے۔ انہی حرکات دیووں اور شیطانوں سے بھی کئی درجہ برتری ہے۔“

روما کی گلیوں میں منہ چھپائے بھاگا چلا جاتا ہے۔ ایک دو نہیں مسیح کے کم و بیش میں تیس مسند نشینوں نے اپنی زندگی کا سفر تلوار کی دھار پر ختم کیا۔
 ۱۸۹۶ء سے ۱۸۹۹ء تک پاپا سے روما کی رہایانے جانشین مسیح کے خلافت ۱۶۱ دفعہ بغاوت کی اور دونوں طرف سے تلواریں بے نیام ہوئیں۔
 اور خون کے دریا بہے!

یورپ کے عہد وسطی کی مسیحیت یہ تھی۔ جسکی یادگار آج ایک بوڑھے میاں اپنے گزشتہ اقبال کا داغ کلیجے سے لگائے ہوئے وٹیکن (پاپا سے روا کا محل) میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ اور کبھی کبھی امن اور صلح کے چند کاغذی پیام دنیا کو بھیجتے ہیں۔ جو ایسے پیاموں کو تلوار کی نوک پر مارتی ہے!

یہ تھا روما جس کو ہم دیکھنے گئے تھے۔ قوموں اور ملکوں کی تاریخ کا مطالعہ کر نیوالے کتابوں کے اوراق پر اپنی ساری عمر نثار کر دیتے ہیں لیکن وہی تاریخ تمام و کمال کسی ایک ٹوٹی ہوئی دیوار کے سایہ میں یا کسی ایک شکستہ محراب کے نیچے بیٹھ کر نظر کے سامنے گزر جاتی ہے۔ میں نے روم کی تاریخ جو کچھ پڑھی وہ کچھ بھی نہ تھی۔ اس کے مقابلہ جو اپنی آنکھوں سے دیکھی!

نیرو روما کا تاجدار اُس عہد کا ہلاک تھا۔ تاریخ اس کے ہولناکی کا ناموں کی تفصیل بیان کرتی ہے۔ جو اس قابل ہے کہ اب بیسویں صدی عیسوی میں تمام یورپ کے دفاتر خارجہ کی دیواروں پر مونے حرفوں میں لکھ کر آویزاں کر دی جاتے۔

۶۴ء عیسوی میں نیرو نے سارے روما کو جلا کر خاک کر دیا۔ اور دوسرے برس اپنے لئے ایک سنہری محل تعمیر کیا۔ جسکی چند اینٹیں اب تک پڑی ہوئی

سینٹ پیٹرس

ہیں۔ ۱۲۳ء میں شاہ ایرلین نے دارالسلطنت کا ایک حصار تعمیر کرایا۔ ۱۲۳۱ء میں قسطنطین نے اپنے جھنڈے پر صلیب کی شکل بنائی۔ مسیح علیہ السلام کے مشہور حواری سینٹ پیٹرس کہا جاتا ہے کہ ۱۲۳۰ء میں روم آئے تھے۔ انہی تعلیمات کا اثر وفات کے ۲۷۰ برس بعد مرتب ہونا شروع ہوا۔ اور قسطنطین نے اپنے عہد میں اس عبادت گاہ کی بنیاد ڈالی جو آئندہ مسیحی دنیا کا سب سے بڑا کلیسا سمجھی گئی۔ اور صدیوں تک مسیحی دنیا کے عظیم الشان انقلابات کا مرکز بنی رہی۔ واقعہ یہ ہے کہ شاید آج دنیا میں کوئی مذہبی عمارت اتنی خوب صورت اور اتنی بڑی موجود نہیں ہے۔ لیکن سینٹ پیٹرس صدیوں کی تاریخی تعمیر کا نتیجہ ہے۔ شروع میں ایک چھوٹا سا مقبرہ اس مقام پر بنایا گیا۔ جہاں قدیم روایات کے مطابق سینٹ پیٹرس مدفون سمجھے جاتے تھے۔ اسی کے پہلو میں نیرو کے عہد جاہلیت کا ایک مندر تھا۔ جو بعد میں منہدم کر دیا گیا۔ اس کے بعد ۱۲۳۱ء تک مسیحیت کی یہ پہلی یادگار بدستور قائم رہی۔ لیکن وہ بہت کمزور ہو چلی تھی۔ اور اندیشہ تھا کہ منہدم ہو جائے گی۔ اس زمانہ میں نکولاس پنجم پاپا کی مسند پر حکم تھا۔ اس نے نئے نقشے تیار کرنے شروع کئے۔ اور پوپ جوگیس دوم نے اس عمارت کا سنگ بنیاد رکھا۔ جو درحقیقت دیکھنے والے کو حیرت کر دیتی ہے۔ پھر بھی یہ عمارت ۱۲۳۱ء تک مکمل نہ ہو سکی۔ آخر پوپ اربن ہشتم نے اس کا افتتاح کیا۔ اس وقت "مقدس سلطنت روم" کا ستارہ اقبال بہت روشن اور بلند تھا۔ چنانچہ اس عمارت کے در و دیوار نے عیسائیت کے بڑے بڑے مذہبی حاکموں کے جاہ و جلال کا منظر دکھا۔ ایک کالا کابل اور والے اور اونٹ کی نکیل پکڑ کر چلنے والے پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کے جان نثار کو نام نہاد جانشینانِ مسیح اپنے عہد گزشتہ کے اس جاہ و جلال کے مقابلہ میں

کتنی ہی عمارت سے دیکھیں لیکن عالم مسیحیت میں روحانیت پر توجہ کے بعد ہی نفس لٹیم حاوی ہو چکا تھا۔ وہاں امارت اور دولت کے کرشمے مسیح کی سند پر بکھرے ہوئے صاف نظر آرہے تھے۔ اسی عمارت کے وسط میں وہ مقام ہے۔ جہاں روما کے بڑے بڑے تاجدار پوپ کے قدم لیتے تھے۔ اور ان کے ہاتھوں سے اپنے سر پر تاج رکھواتے تھے۔ ساری عمارت کی وسعت و بلندی کا اندازہ ایک نظر میں کرنا بالکل ناممکن ہے۔ وسط کے فرش کا طول و عرض شاید اس طرح کچھ سمجھ میں آئے۔ کہ اگر عہد جدید کا بڑے سے بڑا جہاز وہاں رکھ دیں۔ تب بھی فرش کا کچھ حصہ خالی رہ جائے گا۔ سینٹ پیٹرس کے شہ نشینوں میں ۵۰ ہزار رومیوں کے بیٹھنے کی گنجائش بتائی جاتی ہے۔ اور یہ تخمینہ بہت قرین قیاس ہے۔ چھت کی بلندی کا اندازہ یوں کیجئے۔ کہ اگر وسطی گنبد کے اندر جو برآمدہ چھت سے ملا ہوا بنا ہے۔ اس پر کھڑے ہو جاتے۔ تو نیچے فرش پر چلنے والے انسانوں کی جسامت بکریوں سے بھی چھوٹی نظر آنے لگی، عمارت کے ہر حصہ میں ایک پوپ کا مجسمہ اور ایک خوب صورت یادگار نصب ہے۔ اور نیچے تہ خانوں میں اُن جانشینانِ مسیح کی لاشوں کے کبس رکھے ہوئے ہیں ابست سے اسقف اور راہب جو دنیا کے ہر گوشہ سے روما آنے لگے تھے۔ (مورخ نے اُس عہد کے متعلق کہا تھا۔ کہ دنیا کی ہر سڑک روم کی طرف آتی ہے!) اور یہاں کی خوزیزی میں اپنا خون ملا دیتے تھے۔ وہ سب ہی ان ہی تہ خانوں میں سردارانِ مذہب کے پہلو بہ پہلو پڑے ہیں!

صدر عمارت میں شامیسا نہ کے پاس دیوار میں ایک فاختہ کی تصویر چپان ہے۔ یہ فاختہ مسیحیت کی اصطلاح میں "مقدس فاختہ" کہی جاتی ہے۔

سیاسی اصطلاح میں میں اسکو امن کی فاختہ کہتا ہوں۔ یہ وہی امن کی فاختہ ہے۔ جو کبھی مسیحی دنیا میں امن قائم نہ رکھ سکی! جنہوں نے سب سے پہلے اس مقدس فاختہ کا گھونسا سینٹ پیٹرس میں بنایا۔ ان کے ہاتھ بھی کھینچل تک خون میں رنگے رہتے تھے۔ میں جب اس عمارت کی بے مثل صنایعوں کو دیکھتا تھا۔ تو میرا خیال بار بار اس فاختہ کی طرف جاتا تھا۔ کاش کہ جناب پاپا اس کا پتھر لئے ہوئے روم میں نہ بیٹھے ہوتے۔ بلکہ اس کو لیکر ایک دفعہ بلجیم اور فرانس کے ان میدانوں میں بھی آتے جہاں لاکھوں انسانوں کی ہڈیوں کے ڈھیر لگے ہوئے ہیں! مگر غریب فاختہ تو عہد قدیم میں خود اپنے گھر کے اندر امن قائم نہ رکھ سکی۔ اس عہد کے گناہ گار اس کے پروں کے سایہ کے نیچے کیونکر پہنچتے! اب تو پاپا بھی خود کبھی سال دو سال ہی میں اس عباد گاہ کے اندر آتے ہیں۔ اور آتے بھی ہیں تو خفیہ مہرنگوں کے ذریعہ سے! سینٹ پیٹرس کی سیر کرتے ہوئے ہم پاپا کے روم کے دیوار

وٹیکن

کی طرف جانکلے۔ اور معاً یہ معلوم ہوا۔ کہ آج سے دو ہزار برس پہلے کوئی شہر آباد تھا۔ جس میں ہم آج چل پھر رہے ہیں۔ مجھے یہ ادا بہت پسند آئی۔ کہ پوپ نے اپنے گرد و پیش اپنے عہد جاہ و اقبال کی یاد کو ہر طرح تازہ رکھا ہے۔ وہی چھوٹی چھوٹی اینٹوں کی دیواریں۔ وہی پرانی قسم کے دروازے اور راستے سڑکوں پر وہی اینٹوں کا فرش۔ سوائے ایک چیز کے کہ عمارت کے اندر بجلی کے تار لگے ہوئے ہیں۔ کوئی چیز جدید نہیں حتیٰ کہ پوپ کی مختصر فوج کے سپاہی جو دروازوں پر پرادے رہے تھے۔ وہی عہد قدیم کی رنگین وردیاں پہنے ہوئے تھے۔ اس زمانہ کی گھاڑیاں

نئے عہد جدید کی سیاسی اصطلاح میں فاختہ صلح اور امن کا نشان تصور کی جاتی ہے۔

اور موٹریں جو اندر صحن میں کھڑی ہوئی تھیں۔ وہ تو ایسی معلوم ہوتی تھیں۔
 کہ گویا کسی تصویر پر برنما دے ڈال دیئے گئے ہوں۔ اُس سارے منظر
 سے یہ چیزیں جدا اور بے تعلق معلوم ہوتی تھیں۔ پاپائے اعظم کی صورت
 نہ دیکھ سکا۔ لیکن اگر چاہتا تو دیکھنا مشکل نہ تھا۔ اس لئے کہ جو شخص چاہے
 ملاقات کی درخواست کر سکتا ہے۔ خود پوپ اپنے محل سے باہر بھی نہیں جاتا
 سوائے ایک پائیں باغ کے جس میں کبھی کبھی ان کا ہواوار نظر آتا ہے
 شہر روم سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔ اور ان کے محلہ سے سلطنت اٹلی کوئی
 تعلق نہیں رکھتی۔ گویا موجودہ دارالسلطنت کے اندر ایک چھوٹی سی خود مختار
 ریاست ہے۔ جس کے سیاہ سپید کا اختیار پاپائے سدا کسی کو نہیں۔ یہ داتا
 بھی بہت دلچسپ ہے۔ اور اگر موقوفہ ہوتا تو میں اس زمانہ میں اسکی کچھ
 تفصیل بیان کرتا۔ عہد جدید میں ”نان کو اپرشن“ کی ایک بہت بڑی
 مثال ہے۔ پاپائے جو کبھی ساری مقدس سلطنت روم کے مالک و مختار تھے۔
 اب اپنی ذات کو ایک محلہ کے اندر نظر بند کر لیا ہے۔ اور ہر پوپ مدہ اپنے
 تمام عہدہ داروں اور درباریوں کے سینٹ پیٹرس کی مسند پر عہد کرتا ہے۔
 کہ وہ کبھی اور کسی حال میں غاصب شاہ اٹلی کی حکومت کو قبول نہ کرے گا۔ حتیٰ کہ
 اس دربار کے نزدیک سلطنت اٹلی کا کوئی وجود ہی نہیں۔ جو کچھ ہے پوپ
 ہے! شاہ اٹلی کی سلطنت کتنی ہی وسیع اور طاقتور ہو گیا کہ یہاں اس کو
 کوئی نہیں جانتا!

ہر چند کہیں کہے نہیں ہے!

قدیم مسیحیت کا یہ ٹوٹا ہوا بینار ابھی تک اپنا سر اٹھاسے کھڑا ہے۔ اور
 اس کے گرد و پیش ایک نئی دنیا آباد ہے۔ جس پر وہ نفرت کے ساتھ نظر

کرتا ہے۔ جو اس کی طرف حقارت سے دیکھتی ہے۔ اور کبھی کبھی اس کے دامن
عبارت گستاخانہ ہاتھ بھی ڈال دیتی ہے!

جناب پاپا جنگل کے اس مور کی طرح ہیں جو ناچا۔ اور کسی نے اس کو نہ
دیکھا۔ سارے مراسم و مشاغل شاہانہ اسی چار دیواری کے اندر جاری رہتے ہیں
اور چاہے وہ چند ہی ہوں۔ مگر اپنے دربار کے درباری وہی ڈراما لہیٹے رہتے
ہیں۔ جو کبھی اس طرح کھیلنا لگتا تھا۔ کہ دنیا گونج اٹھی تھی۔ گو اس تھینر کے
پر دسے اب بوسیدہ اور بے رنگ ہو گئے ہیں۔ ایکڑ بھی وہ نہ رہے اور جو
ہیں۔ وہ ازکار رفتہ ہیں۔ لباس اور سامان ارٹش بھی پُرانا ہو گیا۔ لیکن بُرا
بھلا تماشا جاری ہے۔ پاپا سے رومانی یہ وضعداری مجھے بھلی معلوم ہوتی ہے
محل کے جو حصے دیکھے جاسکتے تھے۔ ان کو میں نے بہت دلچسپی کے ساتھ
دیکھا۔ لیکن وقت کم تھا۔ اور ان ہزاروں آثار قدیمہ کو دیکھنا تھا۔ جن کا
دامن ساری دنیا کی تاریخ کے ساتھ وابستہ ہے! البتہ ایک چیز کا اور ذکر کر
دوں۔ ہم نے سینٹ پیٹرس میں جو تصویریں لگی ہوئی دیکھیں۔ ان سب
کو قلمی تصور کیا۔ بعد کو معلوم ہوا۔ کہ وہ سب رنگین پتھروں سے بنائی جاتی
ہیں۔ اس صناعتی کو موزیک کہتے ہیں۔ اور اس کا بہت بڑا کارخانہ خود پوپ
کے محل میں ہے۔ جس کو ہم نے اچھی طرح دیکھا۔ درحقیقت حیرت انگیز صناعتی
ہے۔ معمولی الفاظ میں سمجھنا مشکل ہے کہ پتھر کے ٹکروں سے تصویریں
اور ایسی خوب صورت تصویریں۔ کہ من و عن قلمی معلوم ہوں۔ کیونکر بنائی
جاسکتی ہیں۔ ہم نے دیکھا۔ وہ صناعت اس چابکدستی سے اُن تصاویر کو تیار
کرتے تھے۔ کہ اٹلی کے بہترین مصور کی تصویر کو بچہ نقل کر لیتے تھے ہزاروں
مختلف رنگ کے پتھر کے ٹکڑے ان کے سامنے رکھے ہوتے ہیں۔ اور

ایک چوکھٹے میں کوئی چپکے والہ سالہ بھرا ہوتا ہے صنایع ان ٹکڑوں کو اٹھاتا ہے۔ اور اس چوکھٹے میں چپکا دیتا ہے۔ رنگوں کی آمیزش اس خوبی سے کرتا ہے۔ کہ وہ ٹکڑے ملتے چلے جاتے ہیں۔ اور تصویر کا صحیح نقشہ نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ ممکن نہیں کہ ٹکڑے غلط لگ جائیں۔ یا تصویر کی رنگ آمیزی ناقص ہو جائے۔

کلوزیم قدیم مسیحیت کے اس دار السلطنت سے نکل کر ہم کلوزیم دیکھنے گئے۔ کلوزیم کیا ہے۔ آؤ آج سے ایک ہزار آٹھ سو چالیس برس پہلے جو دنیا آباد تھی، گھڑی بھر کے لئے دہاں بھی چلیں۔ اور دیکھیں کہ شہنشاہیوں کے دار السلطنت میں کیا ہو رہا ہے؟ کلوزیم کی سیکڑوں سیڑھیوں پر اندر کی طرف نشست کی ایک جگہ بھی خالی نہیں۔ وسط میں سب سے بلند شہنشاہ روم اپنے تخت پر ریشم کے شامیانہ کے نیچے منکمن ہے۔ قرمزی رنگ کا ایک لباس جسم پر ہے۔ اور دہدہ وطنہ قیصری کا یہ عالم ہے۔ کہ سلطنت کا بڑا سا بڑا سردار بھی تخت شاہی کے قریب آنے کی جرأت نہیں رکھتا، نیچے کی سیڑھی پر روم کی "کنواریاں" بیٹھی ہوتی ہیں جنہیں سے ہر ایک سلطنت روم کے لئے ایک ستارہ سعادت ہے، شہنشاہ کے بعد تمام سرداران مملکت پر افضلیت ان ہی کو حاصل ہے۔ سن رسیدہ کنواریاں جنہوں نے اپنی عمر میں بہت سے تماشے دیکھے ہیں۔ خاموش اور سنجیدہ ہیں۔ لیکن ان میں سے نوجوان لڑکیاں جن کو اس قوم کی توہم پرستی نے عمر بھر کے لئے دنیا سے جدا کر دیا ہے۔ جھکی ہوئی اُس خوشوار تماشہ کو دیکھ رہی ہیں۔ جو رومن قوم کا قومی کھیل ہے! ان کا سانس کستور جلد جلد آ رہا ہے۔ ذرا دیکھنا ان کے چہروں کی رنگت کیوں بدل رہی ہے۔ وہ دیکھو نیچے اکھاڑے میں اُس نوجوان بچاؤں پھیل

گیا۔ جو ابھی ابھی شیر برزتوار کھینچ کر جھپٹا تھا۔ خون کی کیڑا اتنی ہے۔ کہ پاؤں کا جما ہنسل ہو گیا ہے۔ یہ لو اس خونخوار جنگلی بھینسے کی پیٹھ پر ایک دو شیرزہ زنجیروں سے جکڑی ہوئی ہے۔ اور وہ بھینسا اب اس سورما کی جانب آ رہا ہے جس کے ہاتھ میں ایک تیغہ ہے۔ دیکھا؟ اس بھینسے کے سینک نے پہلوان کے سینہ میں شگاف کر دیا۔ اور اسکی خون آلودہ لاش کو روندتا ہوا گزر گیا۔ نوجوان گنوا ری گھبرا گھبرا کر چاروں طرف دیکھتی ہے۔ دل میں کہتی ہے۔ ہاے کیا اس زنجیروں سے جکڑی ہوئی دو شیرزہ کو کوئی نہ بچا سکے گا۔ کیا رومن قوم کا کوئی سورما بھینسے کی خونخواری کا مقابلہ نہ کر سکے گا! ان کنواریوں کی نشست سے نیچے روم کے معمر سردار اور منصب دار اپنی ٹھوڈیوں کو تلواروں کے دستوں پر رکھے ہوئے "تماشہ" دیکھ رہے ہیں۔ ان کے بعد نیچے کی صفوں میں دارالسلطنت کے ہزاروں شہری صف در صف بیٹھے ہیں۔ اکھاڑے میں خوفناک دوندے بڑے بڑے نوجوان پہلوانوں کو چیر رہے ہیں۔ اور چارے ہیں۔ جو سورما اپنی تلوار چمکاتا ہوا گیا تھا۔ ابھی درندوں کے تیز پنجوں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو رہا ہے! اور ہر کھلاڑی جب اس طرح شکار ہوتا ہے۔ تو احسنت و مرجبا کی ۸۰ ہزار آوازیں۔ نعرے اور چیخیں پیہم بلند ہوتی ہیں۔ سب سے آخر میں اس خونیں تماشے کا آخری منظر بھی دیکھ لیجے۔ ایک طرف سے اکھاڑے کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور چند دس بیس بچپن نوجوان اور سن رسیدہ عورتیں اور مرد ہلکا اور بالکل سپید لباس پہنے ہوئے داخل ہوتے ہیں۔ معاً دوسرا دروازہ کھلتا ہے۔ اور دس بیس شیر چیتے مست جنگلی بھینسے اور کچھ نمودار ہوتے ہیں۔ یہ تماشہ چند لمحہ کا ہنگامہ ہے۔ ایک دفعہ پلک ماری چند پنجوں کی آواز آئی۔ اور سناٹا ہو گیا۔ اب سوائے ان درندوں کے

غرائی کے جن کے منہ سے گوشت کے ٹکڑے اور انسانوں کے ہاتھ پاؤں لکھتے نظر آتے ہیں۔ ہر طرف سکوت ہے۔ درندوں کو گرم لوبہ کی سلاخوں سے دروازے کی طرف ہٹایا جا رہا ہے۔ وہ آہستہ آہستہ ہٹتے جاتے ہیں۔ دیکھنا یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ بڑے بڑے بلوں کے منہ میں چھوٹے چھوٹے سفید چوہے ہیں۔ اور ان سے خون کی دھاریں گر رہی ہیں۔ آخر شکار ختم ہو گیا۔ دونوں طرف کے دروازے بند ہو گئے۔ اور اب اکھاڑا خالی ہے۔ کانوں پر ہاتھ رکھ لو۔ پردے نہ پھٹ جائیں۔ رومہ کے ۸۰ ہزار بہادر شہری اس تماشے کی داد دے رہے ہیں! شہنشاہ اپنے غلام کی جانب متوجہ ہوتا ہے۔ اور غلام ادب کے ساتھ ایک ہاتھ سینہ پر رکھ کر مئے ارغوانی کا جام لبریز پیش کرتا ہے۔ بہادر شہنشاہ جام کو منہ سے لگاتا ہے۔ اور کچھ اس طرح مست ہو کر پیتا ہے۔ کہ شراب کے چند قطرے اُس کے منہ سے بھی اُسی طرح گرتے ہیں۔ جس طرح شیروں کے منہ سے انسان کا خون ٹپک رہا تھا! تم پوچھتے ہو۔ یہ سب لوگ کون تھے؟ جس کو شہنشاہ گیتی پناہ نے درندوں کے دسترخوان پر رکھوا دیا؟ میں ایک مورخ کی زبان سے جواب دیتا ہوں +

”یہ سب عیسائی تھے۔ جو مسیح کا پیغام لے کر روم میں آئے تھے!“

تماشہ دیکھ لیا۔ اب عالم خیال سے واپس آئیے۔ اور اینٹوں اور پتھروں کی اُن سرنگھٹ دیواروں کو دیکھیے۔ جو رومہ کے اقبال اور بہادرانِ رومہ کے سپاہیانہ (۱) مشاغل کی آخری یادگار ہیں! کلوزیم! اس نام سے روگئے کھڑے ہوتے ہیں۔ لیکن فلسفی کہتا ہے۔ کہ کلوزیم کے تماشے دیکھنے والوں کو گالیاں نہ دو! وہ تو اُس عہد کی یادگار تھے۔ جب انسانیت نے حیوانیت کی حدود سے ذرا ہی قدم آگے رکھا تھا۔ جسم کے لمبے بال اور نوکدار ناخن باقی

نہ تھے۔ مگر طباطبائی کے اندر بہیمیت کے بہت سے عناصر ہنوز موجود تھے۔ اور
اور کچھ کم سہی وہ عناصر موجود تو اب بھی ہیں۔ مگر میں کہتا ہوں۔ کہ ایسے
انسان صورت درندے تو ایشیا میں بستے تھے۔ یورپ کے آباد اجداد کو اس
جیوانیت سے کیا نسبت۔ وہ تو کچھ اور ہی ہوں گے۔ جیگی اقبال مندی اور علم
بہمتی کی قسم آج تک کھائی جاتی ہے!

عیسائیوں کو ناز ہے۔ کہ انہوں نے مذہب کی خاطر کیسی کیسی سختیاں
بھیلی ہیں! اور آخر ساری دُنیا کو مذہب بنا دیا! لیکن آج اگر پاپائے روم
کلوزیم میں بے قصور عیسائیوں کے درندوں کے سامنے جانے کا ذکر فرمائیں
تو میں عرض کروں۔ کہ عیسائیت کے بہترین زمانہ میں اسپین کی عدالت
احتساب غیر عیسائیوں کے لئے درندوں کی بجائے آگ سے کام لیتی
تھی۔ اتنا ہی توفیق ہے!

عہد قدیم کے اقبال مند ان مذہب طریقوں سے واقف ہی نہ تھے۔ جو
اب استعمال کئے جاتے ہیں۔ نہ ان غیر مذہب فدا یان مسیح کے پاس وہ
جدید آلات عقوبت تھے۔ جو بعد کو دُنیا کی تہذیب جدیدہ نے پیدا
کئے!

شہنشاہ فلیویس ویسپاسیان نے مسیحؑ میں کلوزیم کی بنیاد ڈالی۔ تاکہ
اس کو دربار اور اہل روم کے لئے تفریح کی ایک عمارت عامہ قرار دیا جائے
اور اس زمانہ کی انسانیت کے معیار کے مطابق اس میں سپاہیانہ کھیل
تماشے اور بہادری و جرأت کے مظاہرے ہوا کریں۔ مسیحؑ میں شہنشاہ
ویسپاسیان کے بیٹے ٹیٹس نے اس عمارت کا افتتاح کیا۔ تقریب افتتاح
اس طرح منائی گئی کہ تقریباً ہزار جنگلی درندے اکھاڑے میں چھوڑے

گئے۔ اور ہزاروں سوار (جن کو اس زمانہ کی اصطلاح میں گلیڈیٹرز کہا کرتے تھے۔ *Gladiators*) کرتے تھے۔ اُن درندوں سے دست بدست مقابلہ کرنے کے لئے اندر داخل ہوتے۔ پھر ”جو تماشہ“ اہل روم نے دیکھا۔ وہ اندازہ تخیل سے باہر ہے ہزاروں درندے ہزاروں انسانوں کو لپیٹے ہوئے تھے۔ ان کی تلواریں ان کے جسم میں اور ان کے تنجے انکی کھال میں پیوست تھے۔ گوشت کے پرزے ادھر ادھر اڑ رہے تھے۔ اور خون کے فوارے تماشائوں کی صفت اول تک پہنچتے تھے۔ ہزاروں انسان اور درندے اس طرح فنا ہوئے۔ کہ لاشیں بھی پہچانی نہ جاتی تھیں! بہادر اہل روم کی تماشہ گاہ کا افتتاح یوں عمل میں آیا!

عمارت ایک سوسترگز بلند ہے۔ اور اس کا محیط ۵۰ گز ہے۔ دیواروں کا نیچے کا ایک حصہ ابھی تک محفوظ ہے۔ اور آثار قدیمہ کے ماہرین نے ایک چھوٹے سے حصہ کو اسی طرح درست کر دیا ہے۔ جس طرح کہ ان کے خیال میں وہ شہنشاہ ٹیس اور اس کے جانشینوں کے عہد میں تھا۔

رومی حمام مہذب رومن شہری جب کلوزیم کے تماشوں سے سیر ہو جاتا تھا۔ تو اپنا وقت ان حماموں میں صرف کرتا تھا جن کے نام سے آج تک یورپ کے بہترین حمام منسوب کئے جاتے ہیں لیکن ان حماموں کے آثار کو دیکھ کر معلوم ہوتا ہے۔ کہ دولت و سطوت و نفس پرستی کے اس عہد جدید میں حمام کی وہ عظیم الشان عمارتیں و خواب و خیال سے باہر ہیں۔ اور لندن و پیرس کے جو حمام ہم دیکھتے ہیں وہ تو روم کے قدیم حماموں کے مقابلہ میں محض کھلونا ہیں۔ روم میں یوں تو بہتر سے بہتر حمام موجود تھے۔ لیکن کراکلا کا حمام عامۃ الناس کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ جس میں ۶۳ ہزار

آدمی روزانہ اور اکثر یہ یک وقت غسل کرتے تھے۔ ناشتہ ہر شخص کو مفت ملتا تھا! سیکڑوں سنگ مرمر کے ستون۔ متعدد بڑے بڑے حوض گرم پانی کے نل۔ سنگ مرمر کے فرش کی بے مثال چمک کاری۔ بیٹھنے کے لئے کریا چبوترے جن پر لیٹ کر خوشبوئیں ملوانی جاتی تھیں۔ وسیع برآمدے جہاں ناشتہ کیا جاتا تھا۔ یعنی جب وہ حمام اپنی پوری آرائش کے ساتھ آباد ہوگا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ اس کا ہر کمرہ دیوان عام اور دیوان خاص سے وسعت اور خوب صورتی میں کسی طرح کم نہ ہوگا۔ اور کہنے کو کچھ بھی نہ تھا اہل روم کا محض حمام تھا! قیمتی پتھروں کے نہانے کے حوض اور ٹپ اور طشت آج تک پاپائے روم کے عجائب خانہ میں موجود ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ ان قیمتی پتھروں کے اتنے بڑے ٹکڑے کہاں سے آئے کہ ایک رومی کی پوری جسامت کے قابل غسل کرنے کا حوض ایک ایک ٹکڑے میں سالم بنالیا گیا۔ عہد قدیم کی ان عجائبات کو دیکھئے اور حیران رہ جائیے!

میں چاہتا تھا۔ کہ روم کے آثار قدیمہ کی دلچسپ داستان کو اسی طرح تفصیل کے ساتھ جاری رکھوں۔ لیکن نہ ہو سکا۔ دس سال سے زیادہ ہو گیا مسودہ پڑا ہوا ہے۔ اور احباب کے تقاضے ہیں۔ کہ مکمل یا غیر مکمل جو کچھ بھی ہو کسی طرح چھپ جائے۔ میں بھی اب کچھ اکتا گیا ہوں۔ اس لئے بقیہ داستان مختصر کرتا ہوں:-

میں سمجھتا ہوں کہ میں نے قدیم روم کو خوب دیکھا۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ کہ اس کا دسواں حصہ بھی نہ دیکھ سکا اور قدر قلیل جو کچھ دیکھا۔ اس کا

عشر عشر بھی ان صفحات پر نہ لاسکا +

کلوذیم کا مد مقابل فورم کا عظیم الشان کھنڈر ہے۔ میں نے غلط کہا۔ وہ کھنڈر کھنڈر نہیں ہے۔ ایک عظیم الشان آبادی ہے! خالی انسان کا گوشت و پوست اُن ٹوٹی دیواروں اور شکستہ محرابوں میں متحرک نظر نہ آئے۔ لیکن تصور انسانی کا غیر فانی حصہ آج بھی اُن مٹی اور پتھر اور اینٹوں کے ڈھیر میں زندہ موجود ہے! جولیس سیزر اور اس کے قاتل کے تمام نقوش زندہ ہیں۔ روم کی مقدس کنواریاں بھی اپنے گھروں کی چار دیواری میں زندہ موجود ہیں۔ اس راستہ کے نشانات بھی زندہ ہیں۔ جس پر روم کے تاجدار گزرا کرتے تھے۔ اور اُس کے وہ تاجدار بھی زندہ ہیں۔ اگر ان سب کو مردہ کہتے ہو تو پھر یقین جانو کہ تمہیں زندگی کے معنی معلوم نہیں! خاک کی ڈھیروں اور قبروں کے کتبوں کی جانب کیا دیکھتے ہو۔ نہ زندگی ماں کی گود میں ہے نہ موت قبر میں! ماں کی گود سے الگ ایک زندگی ہے۔ وہی اصلی زندگی ہے۔ قبر سے دور ایک موت ہے۔ وہی موت ہے!

قدیم روم کے سورماؤں اور تاجداروں کو جتنا چاہو بُرا کہو مگر ان کے زندہ ہونے سے انکار نہیں کر سکتے۔ ان گرے ہوئے میناروں۔ ٹوٹے ہوئے ستونوں اور جھکی ہوئی دیواروں سے پوچھو وہ گواہی دیں گی۔ کہ ہمارے سائے جولیس سیزر کے سینہ میں چھری ماری گئی تھی۔ مگر وہ مرا نہیں۔ ہمارے سائے بروٹس مارا گیا تھا۔ مگر وہ مرا نہیں۔ ہم نے دیکھا انٹونی سیزر کی لاش کا منہ کھول کھول لکھ دیکھا رہا تھا۔ لیکن سیزر ہمارے پاس کھڑا ہنس رہا تھا! ہم زندہ ہیں اور ہمارے پاس جو کچھ ہے۔ سب زندہ ہے! ظالم بھی اور مظلوم۔ حسن بھی اور عشق بھی۔ سورما بھی جس نے بر پھول اور تلواروں کے رخم کھائے

اور وہ یونانی غلام بھی جو کلوزیم میں خوشخوار درندوں کے سامنے ڈالے گئے۔
وہ لڑکی بھی زندہ ہے۔ جس کی عصمت چھینی گئی۔ اور تار کوین بھی !
اس تفسیر حیات۔ اس ہنگامہ زندگی کی تصویریں میں ان صفات پر کیونکر
کھینچوں ! ایک ہفتہ کے مختصر قیام میں دن دن بھران کھنڈوں میں مارا پھرتا
تھا۔ پھر بھی مجھے اعتراف ہے۔ کہ قدیم روم سے ذرا بھی واقف نہیں اس
اس داستان کو یوں ہی چھوڑ دیجئے !

روما میں ترک احباب کا ایک اچھا اجتماع ہے۔ اور واقعہ یہ ہے۔ کہ پیرس
اور رومادو ہی مقامات ہیں۔ جو اس وقت یورپ میں انگور کی سیاسی دروست
کا مرکز ہیں۔ ایک حیثیت سے روما۔ پیرس سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔
یعنی یہ کہ فرانس بہ نسبت اٹلی کے برطانیہ کی پالیسی کے خلاف جانے کی
جرات نہیں کر سکتا۔ مگر اٹلی چونکہ یونان کے ساتھ ایک قدیم عداوت رکھتا ہے
اس لئے موجودہ کشمکش میں خواہ برطانیہ کی پالیسی کچھ ہو۔ وہ کسی طرح یونان
کی پیش قدمی کو پسند نہیں کرتا اور غالباً یہ سچ ہے۔ کہ اٹلی سے انگور کو معتد
امداد بھی ملتی رہی ہے۔ سامان جنگ کے اناطولیہ پہنچنے کا یہی ایک راستہ ہے
اس لئے ترک بھی اٹلی کی دوستی کو بہت قابل قدر سمجھتے ہیں۔ علاوہ بریں۔
روما میں انگور کے نمایندوں نے اپنا کافی اثر قائم کر لیا ہے۔ اور ہم نے دیکھا
کہ اٹلی کی خارجی پالیسی میں ترک خاصہ حصہ لے رہے ہیں۔ یورپین اقوام
کی دوستی کچھ زیادہ قابل اعتبار نہیں ہوتی۔ اس لئے اس پر بھروسہ کرنا یا
کوئی خوشگوار پیشین گوئی کرنا مناسب نہیں۔ لیکن اگر افواہیں بے حقیقت نہیں
تو امید کی جاتی ہے۔ کہ شاید بہت جلد انگور اور اٹلی کے درمیان کوئی ایسا

معاہدہ ہو جائے گا۔ جو اتحادیوں کے نام نہاد اتحاد کو بیکرد صدمہ پہنچائیگا۔
ہنریکسنسی جاتی بے جوہاں حکومت انگور کے نمائندے ہیں۔ ایک
بہت ہی ذکی اور ہوشمند مدبر معلوم ہوتے ہیں۔ اس وقت تک جتنے ترک احباب
سے ملاقات ہوئی۔ ان میں بلحاظ تدبر و معاملہ فہمی جاتی بے سب سے زیادہ
سمجھدار اور زیرک معلوم ہوتے ہیں۔ افسوس ہے۔ کہ وہ انگریزی نہیں جانتے
اس لئے ان سے جب کبھی گفتگو ہوئی ترجمان کے ذریعہ سے ہوئی۔ مگر روم
میں سب سے زیادہ دلچسپ شخصیت عبدالحمید سعید بے کی دیکھی۔ عجیب غریب
انسان ہیں۔ ان کو دیکھتا تھا۔ اور شوکت بھائی یاد آتے تھے۔ بلحاظ جسم و ستہ
کے شوکت بھائی سے کچھ زیادہ ہی ہیں۔ قد میں بھی۔ وزن میں بھی۔ اور ہاتھ پاؤں ہیں
بھی۔ شاید وہ موہنی اور وہ دلکش شخصیت تو نہ ہو۔ مگر باقی ہر حیثیت سے
عبدالحمید سعید بے شوکت بھائی کی ہو بہو تصویر ہیں۔ داڑھی بھی وہی ہے۔ گو
نھوڑی ہے۔ حالت جوش میں وارفتگی بھی وہی ہے۔ آنکھوں کی چمک بھی
وہی ہے۔ البتہ زبان کی تیزی ویسی نہیں۔ آہستہ بولتے ہیں۔ یا شاید ہماری
وجہ سے (چونکہ ہم انکی زبان سے ناواقف تھے) آہستہ بولتے ہوں۔ صاحب
موصوف ایک سپاہی منش رومی ہیں۔ کئی لڑائیوں میں شریک ہو چکے ہیں۔
جسم پر بہت سے زخموں کے نشانات ہیں اور جب کبھی اپنی اس سپاہیانہ زندگی
کے واقعات سننے شروع کر دیتے ہیں۔ تو یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ شخص خون
پیتا ہوگا۔ اور خون کھانا ہوگا۔ لیکن واقعہ یہ ہے۔ کہ یہ دیو صورت اور فرشتہ سیرت
انسان اسلامی شجاعت اور عصبیت کی ایک عجیب دل آویز تصویر ہے۔ میرا
ان کا عجیب معاملہ رہا۔ وہ انگریزی نہیں بول سکتے تھے۔ اور میں نہ فرانسیسی
بول سکتا۔ نہ عربی۔ لیکن جی چاہتا تھا۔ کہ کسی طرح ان سے باتیں ہوں۔

آخر گو نگے بہروں کے اشاروں سے آغاز کار ہوا۔ اور ٹھوڑی ہی دیر میں سقہ
جلد اشارے ہونے لگے۔ کہ باتوں کے دریا بہ گئے۔ انھیا میرا اشارہ اتنی
داستان بیان کر دیتا تھا۔ جو شاید پندرہ منٹ کے مسلسل محکم کے بعد ادا ہوتی
اشاروں ہی اشاروں میں دونوں طرف سے حال دل بیان ہو گیا۔ میں تو
صاحب موصوف سے شوکت بھائی کی کشتی بھی بد آیا ہوں۔ اور کہہ آیا ہوں
کہ جب دونوں صاحبان کو خدا کبھی بخیر و خوبی ملائیگا۔ اور تمام بندہ بندوں
کے بھلے دن آئیں گے۔ تو عبد الحمید سعید بے اور مولانا شوکت علی صاحب
کی ایک کشتی بڑے اہتمام کے ساتھ ہوگی! خدا ان کو اپنی امان میں رکھے۔
اسلام کے کیسے کیسے جو اہر ریزے ہیں۔ جو آج وادی غربت میں وطن سے
دور مارے پھر رہے ہیں۔ اور پھر بھی اپنی دھن کے پتے ہیں! یہ مجاہدوں
کی قوم خود زندہ رہیگی۔ اور دوسروں کو زندہ رکھے گی۔ انشا اللہ!

ایک دن ہزار کیسلنسی کے یہاں پرنس سعید حلیم پاشا (سابق وزیر اعظم
دولت عثمانیہ) کی صاحبزادی سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے والد ماجد کا انتظام
کر رہی تھیں۔ جبکہ جلد رہا ہو کر مالٹا سے روما آنے کی امید تھی۔ ہم لوگوں بھی
روانگی کے چند روز بعد صاحب موصوف مالٹا سے رہا ہوئے۔ روم آئے
اور وہاں کسی دشمن اسلام کی گولی کا نشانہ ہو کر شہید ہو گئے۔ مجھے اخبارات
میں یہ خبر پڑھ کر انکی صاحبزادی یاد آئیں۔ جو اس دن کس قدر شوق اور
محبت سے اپنے والد ماجد کی رہائی کا بار بار ذکر کرتی تھیں!

ایک ہفتہ بعد ہم روما سے روانہ ہو گئے۔

پھر چند روز فرانس میں

قمار خانہ پورپ

جس جہاز میں ہم کو مارسیلز سے روانہ ہونا تھا۔ اسکی روانگی قریب تھی۔ اس لئے چند مقامات کو چھوڑ کر جکے دیکھنے کا پہلے ارادہ تھا۔ ہم سید سے مارسیلز کی طرف چل دیئے۔ راستہ میں تھوڑا وقت ملا تو فرانس کے دو مشہور مقامات کو دیکھ لیا۔ شہر تین بھر اوقیانوس کے ساحل پر واقع ہے۔ اور پورپ کے دولتمند اور سیلح سمندر کی آب و ہوا سے متمتع ہونے کے لئے یہاں بہتر آتے ہیں۔ چھوٹا سا شہر ہے۔ مگر آخر ہے تو فرانس! فرانس ہر حال میں فرانس ہے۔ غریب اور امیر بڑے اور چھوٹے۔ وہ ایک خاص ادارہ رکھتے ہیں۔ جو فرانس ہی میں دیکھی جاسکتی ہے۔ اور بلا شرکت غیرے فرانس والوں ہی کا حصہ ہے۔ واہ رے فرانس تیری رعنائی اور کج کلاہی تیرے ہی لئے ہے۔ اور تیرا تخیل زندانہ بھی صرف تیرا ہی ہے۔ مجھ سے کسی نے کہا۔ کہ زمانہ جنگ میں جب تک کہ جرمن توپوں کے گولے شہر پیرس کے اندر نہ گرنے لگے۔ اس وقت تک زندگی کی رنگینیاں اور محفل آرائیاں حسب دستور باقی تھیں۔ پھر جب جرمنوں کی گولہ باری کے باعث شب کو شہر میں اندھیرا رہتا تھا۔ تب بھی مکانوں کے اندر اور تہ خانوں میں فکر و تردد کا دیو کسی نہ کسی طرح قتل کیا جاتا تھا!

نیمس کی خصوصیت اسکی آب و ہوا ہے۔ البتہ تینیس سے چند میل کے فاصلہ پر ایک اور چیز ہے۔ جو ساری دنیا کے بے فکر و اور عیش پرستوں کا مرجع

اور مرکز ہے۔ لب سمندر پہاڑیوں کے دامن میں ایک چھوٹی سی مگر میچد خوب صورت بستی ہے۔ جس کا نام مانٹی کارلو ہے۔ اسکی خصوصیت صرف ایک ہے۔ وہ یہ کہ ساری دنیا کے جواری جو اکھیلنے مانٹی کارلو آتے ہیں۔ اور ہر روز صبح سے شام تک اس چھوٹی سی بستی میں دو چار لکھ پتی مفلس اور محتاج ہو جاتے ہیں۔ اور دو چار مفلس اور محتاج لکھ پتی! صورت یہ ہے۔ کہ مانٹی کارلو کی میونسپلٹی نے بہت بڑے سرمایہ سے ایک قمار خانہ قائم کیا ہے۔ جسکی آمدنی سے خود میونسپلٹی کا کاروبار چلتا ہے۔ صبح دس بجے سے رات کے انسبجے تک اس عالی شان عمارت کے دروازے کھلے رہتے ہیں۔ جس کا جی چاہے ٹکٹ لے کر اندر جائے۔ بہت وسیع عمارت ہے۔ بڑے بڑے کمروں میں میزیں سجی ہوئی ہیں۔ سیکڑوں مرد اور عورتیں بازیاں مار رہے ہیں۔ اور جیت رہے ہیں۔ تمام کمروں میں ایک سکوت مزارطاری ہے۔ سوائے جلد اور آہستہ چلنے والے سانس کے کسی چیز کی آواز نہیں آتی۔ نظریں میز پر جھکی ہوئی بنپس ہاتھ میں ہے۔ کاغذ کے پرزے پر اپنی ہار اور جیت کا حساب لگایا جا رہا ہے۔ کبھی کبھی دور کونوں میں کچھ سرگوشیاں ہو جاتی ہیں۔ میز پر ایک گھومنے والا چکر لگا ہوا ہے۔ جس پر نمبر کندہ ہیں۔ بازی لگانے والے ان نمبروں پر بازی لگاتے ہیں۔ ایک اہلکار اس چکر کو گھماتا ہے۔ جس نمبر پر وہ چکر رکتا ہے۔ اس نمبر پر روپیہ لگانے والے میز پر رکھے ہوئے سکوں کو چاروں طرف سے بٹور کر اپنے سامنے دھیر لگا لیتے ہیں۔ ہر ہاتھ پر ۶ فرانک سے ۶ ہزار فرانک تک بازی لگانے کی اجازت ہے۔ یہ سارا کھیل کامل خاموشی کے ساتھ ہوتا ہے۔ البتہ کبھی کبھی مہینے میں دو ایک دفعہ اس خاموشی کو برہم کرنے والے واقعات بھی پیش آتے ہیں۔ انکی نوعیت یہ ہوتی ہے۔ کہ دفعتاً ایک شخص اپنی ساری

پونجی ہار کر اٹھتا ہے۔ برابر کے کمرے میں جاتا ہے۔ اور اسی لمحہ ایک پستول کے چلنے کی آواز آتی ہے۔ کھیلنے والے دم کے دم سر اٹھاتے ہیں۔ مگر واقعہ اس قدر معمولی ہے۔ کہ کوئی اپنی جگہ سے اٹھ کر دیکھنے بھی نہیں جاتا۔ کھیل جاری رہتا ہے۔ اور قمار خانہ کے ملازمین لاش کو کسی دوسرے دروازہ سے اٹھالے جاتے ہیں امرنے والے کی کرسی پانچ منٹ بھی خالی نہیں رہتی! جن لوگوں سے ابھی ابھی وہ بازیاں بدرہما تھا۔ انہیں یہ بھی خبر نہیں ہوتی۔ کہ کیا ہوا۔ وہاں تو زندگی صرف دو چیزوں سے وابستہ ہے۔ وہ ایک کاغذ کا پرزہ جس پر نفع اور نقصان کا حساب لکھا جاتا ہے۔ اور سکوں کی ڈھیری جو سامنے ہوتی ہے۔ بس۔ اس کے سوا ہر چیز فروعات میں داخل ہے۔ موت اور زندگی کے باقی جھگڑوں سے کسی قمار باز کو کوئی واسطہ نہیں! ہم نے دو چار ہندوستانی (غالباً بنگالی تھے) بھائیوں کو بھی بازیاں لگاتے دیکھا۔ وہ بھی اسی طرح منہمک تھے۔ جس طرح دو سرے حاضرین۔ ہوٹل میں معلوم ہوا۔ کہ اکثر ہندوستانی یہاں جو اکھیلنے کے لئے آتے ہیں۔ یورپ کے تبرکات اور معجزات سے یورپ کا ہندی نژاد شاگرد اپنے یورپین معاصرین سے کچھ کم روشناس نہیں ہوتا! میں تو صرف چند گھنٹے وہاں ٹھہر سکا۔ ورنہ کیا معلوم ہے کہ دو چار بازیاں میں نے بھی بدی ہوئیں! لیکن — ہم تو ہاری ہوئی بازی کھیل رہے ہیں۔ ہماری بازی مانتی کارلو کے قمار خانہ میں نہیں لگی ہے۔ وہ تو لندن کے دفتر خارجہ میں بدی گئی ہے! کھیل قسمت کے ہاتھ ہے۔ ہندوستان والوں نے تو اب اس بازی میں بہت کچھ لگا دیا۔ پانسہ کہ ہر بڑے لگاؤ کو معلوم ہے! ہم قسمت کے قمار باز ہیں۔ اور آج کل ہمارا مانتی کارلو دیکھنا ہو تو ہندوستان کے جیل خانوں کی گلگشت کیجئے!

مانٹی کار لو اور نیس سے ہم سیدھے مارسیلز پہنچے۔ اور دوسرے ہی دن
وہاں سے جہاز پر سوار ہو گئے *

ختم کلام

داستان تمام ہوئی۔ وہ داستان ہی کیا تھی۔ صرف ایک غلط انداز نظر
میں انسان کا دماغ آنکھوں کے ذریعہ سے استفادہ دیکھتا ہے۔ کہ اُسکی تفصیل
اگر عمر بھر لکھنا چاہے تو نہ لکھ سکے۔ میں نے تو دنیا کا بڑا حصہ ایک نظر دیکھ لیا۔ کیا
کیا لکھتا اور کیونکر لکھتا! ابتدائی اوراق میں عرض کر چکا ہوں۔ کہ میں نے مشرق
کی نظر سے مغرب کو دیکھا۔ لوگ پوچھتے ہیں۔ کہ تو نے مغرب کو کہاں تک
مشرق سے روشناس پایا۔ اگر کوئی مجھ سے پوچھے۔ کہ میں نے قطب شمالی کو
قطب جنوبی سے کے گز کے فاصلہ پر پایا۔ تو بتائے۔ کہ کیا کموں! روشناسی!
یورپ کے عہد وسطے میں جب مشرق کے لوگ غلام بنا کر یورپ میں لائے
جاتے تھے۔ اس وقت ان غلاموں سے جو وقف ان کے مالکوں کو ہوتا تھا
وہی آج بھی ہے۔ اثنا تو جانتے ہیں۔ کہ یہ سانولے اور کالے رنگ کے انسان
اُن ملکوں میں رہتے ہیں۔ جہاں ہماری تجارت اور حکومت بار آور ہوتی
ہے۔ یہ کیا ہیں۔ یہ بھی انسان ہیں۔ یہ بھی دل و دماغ رکھتے ہیں۔ یہ بھی کسی
تہذیب و تمدن کے وارث ہیں۔ ان کے گھر بھی کبھی چراغ جلتا تھا۔ یہ بھی
دنیا پر حکومت کرنا جانتے ہیں۔ ان باتوں کو یورپ کا سرمایہ دار کچھ نہیں جانتا
سنتے تھے۔ کہ یورپ میں ایشیا کے فنون لطیفہ اور صنایعوں کی قدر کی جاتی
ہے۔ وہاں بڑے بڑے عالی دماغ مستشرقین ہمارے حالات کی تحقیق

میں اپنی عمریں صرف کرتے ہیں۔ شاید ایسا ہی ہو۔ لیکن میں تو سیکڑوں فریسٹوں اور دوسرے یورپین اصحاب سے ملا۔ پہلے سفر میں بھی اور دوبارہ اب جب کہ تجارت کے سلسلہ میں ہر قسم کے لوگوں سے واسطہ پڑتا تھا۔ میں نے جو کچھ دیکھا اس کی چند مثالیں کافی ہیں:-

پیرس میں جو لوگ اسلامی معاملات میں بہت دلچسپی لینے والے سمجھے جاتے ہیں۔ اس میں ایک معمر بزرگ جو بہت دولت مند اور اپنے ملک کی حکومت میں بااثر شخصیت رکھنے والے ہیں۔ اکثر ملا کرتے تھے۔ ایک دن فرمانے لگے۔ کہ میں حیران ہوں۔ آپ لوگ غیر قوم کی حکومت کیوں گوارا کرتے ہیں۔ جبکہ اس قوم کا قبضہ محض ہندوستان کے سوا اصل پر ہے۔ آخر باقی ملک تو آزاد ہے۔ اسکی آبادی کیا کرتی ہے!!!

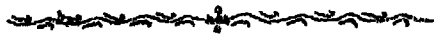
اب فرمائیے؟ یہ بزرگ اسلامی اور ایشیائی معاملات سے بہت واقف سمجھے جاتے ہیں!!! ایک نوجوان رئیس زادہ سے ملاقات ہوئی جو کبھی کبھی اخبار نویسی بھی کرتے ہیں۔ ایک دن ارشاد ہوا۔ کہ ”ہندوستان کتنا بڑا جزیرہ ہے۔ بہت بڑا ہوگا“ ایک صاحب کو عرصہ تک یہ مخالطہ رہا۔ کہ ہم لوگ امریکہ کی طرف کے رہنے والے ہیں! یونیس کے ایک عنایت فرما کر آکر آتے تھے۔ وہ بہ مشکل اس غلط فہمی سے نجات پاسکے۔ کہ ہندوستان میں نہ بڑے بڑے سرسبز پہاڑ ہیں۔ اور نہ وہاں ریل چلتی ہے! غرض کیا کہوں کیسے کیسے آشنا اور واقف کار ملے! اور سنئے:-

مجھے یہ شوق تھا کہ جب کبھی کسی ٹھیٹر یا متحرک تصویروں کے تماشے میں کسی ایشیائی داستان کے پیش کئے جانے کا اعلان ہوتا تھا تو میں اس کو دیکھنے ضرور جاتا تھا۔ یہ تو سب جانتے ہیں۔ کہ یورپ نے ڈراما اور ٹھیٹر کے فنون میں

عجیب غریب ترقی کی ہے۔ اور یہ سچ بھی ہے۔ کہ ہندوستان کے تھیٹروں کو یورپ کے تھیٹروں اور خصوصاً پیرس کی تماشہ گاہوں سے کوئی نسبت ہی نہیں۔ بلکہ ایک ایک تماشہ کی تیاری میں لاکھوں روپیہ صرف کیا جاتا ہے۔ اور برسوں تحقیق و تفتیش کے بعد کہیں ڈراما تیار کرتے ہیں۔ کتابوں اور تاریخوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ عمارات کو دیکھتے ہیں۔ لوگوں کے رسم و رواج کو سمجھتے ہیں۔ تب کہیں ڈراما ایجنج پر لاتے ہیں۔ لیکن جہاں تک ایشیا کا تعلق ہے۔ نتیجہ کیا ہوتا ہے ایک دن سنا کہ کسی تماشہ گاہ میں سلیمان و بلقیس کا تماشہ متحرک تصاویر میں دکھایا جاتا تھا۔ میں حسب عادت دیکھنے گیا۔ ویکھتا کیا ہوں۔ کہ حضرت سلیمان کا ایک عظیم الشان دربار جما ہوا ہے۔ جس میں درباری عجیب عجیب قسم کے زرق برق لباس پہنے کھڑے ہیں۔ ایرانی قالین بچھے ہوئے ہیں۔ اور فرانس کے شیشہ آلات لگے ہوئے ہیں۔ مکان ایسا ہے۔ جیسے کسی مغل بادشاہ ہندوستان کا محل۔ بلقیس تشریف لاتی ہیں۔ تو ان کا لباس یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ ابھی ابھی پیرس کی کسی بڑی دکان سے تیار ہو کر آیا ہے۔ اونچی ایڑی کے جوتے پہنے ہوئے ہیں۔ سر ننگ ہے۔ اور یورپین وضع کے مطابق سینہ بھی نیم برہنہ ہے۔ یہ بلقیس نہیں بیٹھا ہوا ان مشرق کے مصوروں کو کو سنار ہا۔ کہ کم بخت ہمارے حالات کے سمجھنے میں عمریں بسر کرتے ہیں۔ اور پھر بھی بلقیس کو اونچی ایڑی کا جوتا پہنا دیتے ہیں۔

ایک دوسرے تماشے میں جانے کا اتفاق ہوا۔ یہاں ایک منظر دکھاتے ہیں۔ جس میں کسی اسلامی ملک کے رسم و رواج کا مرقعہ ہدیہ ناظرین کیا جاتا ہے۔ اس تماشہ میں کئی دفعہ نماز پڑھتے مسلمان دکھائے جاتے ہیں۔ یعنی اس طرح کہ کھڑے ہوئے ہاتھ آسمان کی طرف سیدھے کھڑے کئے (یہ گویا نیت باندھی)

فرانزین پرپٹ لیٹ گئے (اس میں رکوع و سجود سب شامل ہے) اور دامن
 جھاڑ کر کھڑے ہو گئے! اس کا نام نماز ہے۔ خدا سمجھے ان مدعیوں سے جو
 مشرق سے اپنی واقفیت کے کیسے کیسے دعوے کرتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے۔
 کہ ہماری زندگی کی اسجد سے بھی واقف نہیں۔ فرانس کی حکومت میں بہت
 مسلمان رعایا ہے۔ جس کے شہروں میں فرانسیسی حکام اور تاجرانہ اپنی عمریں گزار
 ہیں۔ ہزاروں عرب فرانسیسی فوج میں ملازم ہیں۔ لیکن کسی فرانسیسی مشرق
 کو آج تک صحیح طور پر یہ بھی معلوم نہیں۔ کہ نماز کس طرح ادا ہوتی ہے۔ میرا
 عقیدہ تو یہ ہے۔ کہ یورپین اقوام غیر قوموں سے واقف ہونے کی اہلیت ہی
 نہیں رکھتیں۔ وہ ہماری زندگی کے کسی ایک پہلو سے بھی آشنا نہیں ہو سکتیں
 الا یہ کہ تجارتی اور صنعتی ترقی نے ان کو ہماری فہمتوں کا مالک بنا دیا ہے۔ اور
 ان کا عقیدہ یہ ہے۔ کہ گورے رنگ کی اقوام کا فطری حق ہے۔ کہ وہ کالے
 رنگ کے لوگوں پر حکومت کریں۔ عہد جدید کی عالمگیر تحریک اسی عقیدہ کا نتیجہ
 اور اسی جہل کا جواب ہے۔ اور ان خود بینوں کا یہی ایک جواب ہے۔ جو دیا
 جاسکتا ہے۔ اور دیا جانا چاہیے۔



دارالاشاعت لاہور

دارالاشاعت پنجاب لاہور ۱۹۹۶ء میں لاہور میں قائم ہوا۔

تھا۔ اور اس ۲۵ سال کے عرصے میں اس نے ملک کی تعلیمی خدمات اس

خوبی سے سرانجام دی ہیں۔ کہ تمام ملک نے اس کا اعتراف کیا ہے۔

دارالاشاعت مذکور نے ۱۹۹۶ء میں مستورات کیلئے ایک اردو ہفتہ وار اخبار تہذیب نوا

جاری کیا جو اب تک ہر مہینہ ۷۰۰۰۰ روپے کی سرپرستی اور محترمہ آصف جہاں بیگم کی اڈیٹری

میں جاری ہے۔ یہ اخبار تمام ہندوستان میں سب سے پہلا زمانہ ہفتہ وار اخبار ہے۔ اور اس نے ہندوستان

کی مستورات کی تعلیم و ترقی اور بیداری میں بے انتہا قابل قدر خدمات سرانجام دی ہیں۔ ملک کی قابل تعلیم و

مستورات اور عوام اس میں نہایت مفید مضامین لکھتے ہیں۔ اور یہ اس احتیاط سے اڈٹ کیا جاتا ہے۔ کہ معزز

شرفاطمینان سے اس کو اپنی مستورات کے ہاتھوں میں جانے دیتے ہیں۔ اسکی سالانہ قیمت مع محصول

۱۰ روپے۔ نمونہ مفت +

دارالاشاعت سے مختلف پتوں کیلئے ہفتہ وار اخبار چھپوے شائع ہوتا ہے۔ اس میں نہایت آسان و

دلچسپ اور نصیحت خیز کہانیاں خلاق کی درستی اور معلومات کے بڑھانے والے مضمون اور مزید نظمیں درج ہوتی

ہیں اس کا خد بھی جلی ہے۔ کہ بچے آسانی سے پڑھ سکیں۔ اور اسکی مقبولیت اس سے بخوبی ظاہر ہوتی

ہے۔ کہ چنانچہ ایک ہفتہ کی کئی سالوں سے اسے ہزاروں کپی تعداد میں خوب کر سرکاری سکولوں

میں پہنچاتی ہے۔ اسکی سالانہ قیمت مع محصول اک ۱۰ روپے۔ نمونہ مفت +

دارالاشاعت پنجاب لاہور میں پتوں۔ لڑکوں۔ اور لڑکیوں۔ عورتوں اور مردوں

کیہ رہنمائی ملے گی اور کتب بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ فہرست کتابیں

ار کا کتب خانہ کرمہ۔ ملاحظہ فرمائیے۔

دارالاشاعت پنجاب لاہور

۱۹۹۵ - ۱۹۹۶

لاہور

دارالاشاعت پنجاب لاہور میں پتوں۔ لڑکوں۔ اور لڑکیوں۔ عورتوں اور مردوں کی رہنمائی ملے گی اور کتب بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ فہرست کتابیں

ॐ ५० ६

११५

This book was taken from the Library
on the date last stamped. A fine of
1 anna will be charged for each day
the book is kept over time.
